قرآن کریم اور سنت نبویہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کی تعلیمات کا علمبردار

بینات

جلد: ۷۷ شمارہ: ۹، ۱۰
رمضان وشوال: ۱۴۳۵ھ - اگست: ۲۰۱۴ء
قیمت فی شمارہ: ۳۰ روپے، زرِ سالانہ: ۳۵۰ روپے

مدیر / مدیر مسئول
مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر

نائب مدیر
مولانا سید سلیمان یوسف بنوری

مدیر معاون
مولانا محمد اعجاز مصطفیٰ

ناظم
مولانا فضل حق یوسفی

خط وکتابت اور ترسیل زر کا پتہ

دفتر ماہنامہ ’’بینات‘‘ جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن
کراچی 74800، پوسٹ بکس نمبر 3465
فون دفتر ’’بینات‘‘: 021-34927233

اکاؤنٹ نمبر

اکاؤنٹ نمبر: 7-397-101900 برانچ کوڈ: 0816
مسلم کمرشل بینک علامہ بنوری ٹاؤن برانچ کراچی 74800

بیرون ملک سے بذریعہ ہوائی ڈاک

ریاست ہائے متحدہ امریکہ، جنوبی افریقہ، تھائی لینڈ، ناروے، ویسٹ انڈیز وغیرہ: 35 امریکی ڈالر
سعودی عرب، متحدہ عرب امارات، مسقط، بحرین، عمان، ایران، انڈیا وغیرہ: 27 امریکی ڈالر
بنگلہ دیش: 25 امریکی ڈالر

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ
علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن

فون: 34913570 - 34123366 - 34121152 **Ext.** 146 - 147
فیکس: +92-21-34919531

Web: www.banuri.edu.pk ***Email***: bayyinat@banuri.edu.pk

ناشر: مولانا ڈاکٹر عبد الرزاق اسکندر **مطبع:** ایجوکیشنل پریس **طابع:** فیروز زکی

www.banuri.edu.pk

فہرستِ مضامین

بصائر و عبر

سندھ ہائی کورٹ کا تاریخی فیصلہ!	۳	محمد اعجاز مصطفیٰ
حضرت اقدس مولانا سید محمد اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت	۱۰	

مقالات و مضامین

دینِ اسلام سے مسلمانوں کی روگردانی	۱۳	محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوریؒ
اسلام کا قانونِ جنگ، امن و عافیت کا ضامن!	۱۶	مولانا رفیع الدین حنیف قاسمی
عہدِ رسالت میں صحابہ کرامؓ کی فقہی تربیت (قسط:۳)	۲۳	مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی
کعب احبارؒ اور اسرائیلیات	۳۳	مولانا محمد بلال بربری
توبہ کا مفہوم، اقسام و اہمیت اور طریقہ کار	۳۸	مفتی عارف محمود
کیا اسلام جدید تعلیم کے خلاف ہے؟	۵۱	مولانا محمد یعقوب خاصخیلی
فریضۂ زکاۃ اور اس کی ادائیگی (قسط:۲)	۵۳	مفتی محمد راشد ڈسکوی
قرآن مجید کے حقوق اور ہمارا طرزِ عمل	۶۱	مولانا سید عبدالوہاب شیرازی
اسلامی تہوار!......فلسفہ، اثرات، امتیازات	۷۳	مولانا محمد طفیل کوہاٹی
اولاد کی ظاہری و باطنی تربیت.....اہمیت و انداز	۷۸	محمد شفیق الرحمٰن علوی
موجودہ دور میں شریعت اسلامیہ کا نفاذ کس طرح ممکن ہے؟	۸۳	مولانا محمد سمیع اللہ

یادِ رفتگان

حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینیؒ	۹۶	قاری تنویر احمد شریفی

دار الافتاء

غیر مسلموں کے تہوار پر مسلمان کا ہدیہ قبول کرنا!	۱۰۳	ادارہ

www.banuri.edu.pk

سندھ ہائی کورٹ کا تاریخی فیصلہ!

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للّٰہ وسلام علٰی عبادہٖ الذین اصطفٰی

گیارہ جون ۲۰۱۴ء بروز بدھ تقریباً ساڑھے گیارہ بجے دن ایڈووکیٹ جناب منظور احمد میٔو صاحب کا فون آیا کہ عدالت میں ایک سابقہ ہندو بچی جس کا اسلامی نام عائشہ رکھا گیا ہے، اس کا کیس لگا ہوا ہے، آپ یہ بتایئے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے عمر کی کوئی حد ہے یا نہیں؟ اور یہ کہ کسی صحابیؓ کا نام بتا دیجیے جس نے بچپن میں اسلام قبول کیا ہو۔ میں نے سیدنا علی المرتضٰی رضی اللہ عنہ کا نام نامی اسم گرامی لیا کہ انہوں نے آٹھ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمان کے مطابق اپنے ایمان لانے کو اپنے باپ سے مخفی رکھا۔ اور ایک یہودی بچہ جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت کیا کرتا تھا، وہ بیمار ہوا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کی عیادت کے لیے اس کے گھر تشریف لے گئے، اور اس کے سرہانے بیٹھے، وہ بچہ اس دنیوی زندگی میں چند لمحوں کا مہمان تھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس پر اسلام پیش کیا، بچے نے سوالیہ نظروں سے باپ کی طرف دیکھا، باپ نے اجازت دے دی، اور کہا: ’’أطع أبا القاسم ‘‘...’’ابوالقاسم (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی بات مان لو‘‘۔ اس نے کلمہ پڑھا، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ’’الحمد للّٰہ الذی أنقذہ من النار ‘‘...’’تمام تعریفیں اس ذات کے لیے ہیں جس نے اسے آگ سے نجات اور خلاصی عطا فرمائی‘‘۔ (صحیح بخاری، ج:۱،ص:۱۸۱)

اس کے علاوہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے بھی اپنے باپ سے پہلے بچپن میں اسلام قبول کیا، حضرت ابومحذورہ رضی اللہ عنہ جو اسلام قبول کرنے کے بعد مسجد حرام کے مؤذن بنائے گئے، انہوں نے بھی چھوٹی عمر میں اسلام قبول کیا، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ بھی بچپن میں اسلام لائے، حضرت زبیر رضی اللہ عنہ بھی آٹھ برس کی عمر میں اسلام لائے۔ اس کے علاوہ بھی کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جو بچپن میں اسلام لائے۔ میں

نے یہ چند نام ان کو بتلا دیئے، جو اس وقت میرے ذہن میں تھے، الحمد للہ! تین بجے کے قریب فون آیا کہ مبارک ہو، کیس کا فیصلہ نومسلمہ بچی عائشہ کے حق میں ہوا، **الحمد للّٰہ علٰی نعمۃ الإسلام۔**

جی میں آیا کہ سندھ ہائی کورٹ کے اس تاریخی فیصلہ کی روداد قارئین بینات تک بھی پہنچائی جائے۔ عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کے قانونی مشیر ایڈووکیٹ جناب منظور احمد میئو صاحب نے جو کچھ اس کیس کے بارے میں لکھ کر دیا، اس کی تلخیص یہ ہے کہ:

۱۶ر جنوری ۲۰۱۴ء کو سانگھڑ سے ایک نامعلوم خاتون نے فون کیا کہ میں پوجا بائی بات کر رہی ہوں، میں پیدائشی ہندو ہوں، انٹر کی طالبہ ہوں، میں نے اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کیا ہے، میں اسلام قبول کرنا چاہتی ہوں، آپ میری قانونی مدد کریں۔ منظور صاحب نے اسے کچھ قانونی مشورے دیئے۔ اور عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت کراچی دفتر کے ناظم اعلیٰ رانا محمد انور صاحب سے پوری صورت حال گوش گزار کی تو انہوں نے فرمایا کہ: ہماری جماعت قانون کے دائرہ میں رہتے ہوئے اس بچی کی اخلاقی و قانونی ہمہ قسم کی مدد کرنے کو تیار ہے، جس پر منظور احمد میئو صاحب کو مزید حوصلہ ملا اور انہوں نے اس کیس کو شروع سے آخر تک اپنے ہاتھ میں رکھا، اس بچی نے سانگھڑ سے کراچی کا سفر اکیلے کیا اور سترہ جنوری ۲۰۱۴ء کو سٹی کورٹ مجسٹریٹ صاحب کی عدالت میں پیش ہو کر اجازت خود مختاری حاصل کی، جس میں تحریر تھا کہ:

''میں قرآن پاک کے متعلق بہت عرصہ سے معلومات اور تعلیم حاصل کر رہی ہوں اور اس کے متعلق رہنمائی اپنے ساتھی بچوں اور ان کے والدین سے جب کبھی ملاقات ہو جاتی تھی، ملتی رہتی تھی۔ میں اسلامی لٹریچر بھی پڑھتی رہتی تھی۔ میں اپنے دل سے اور اپنی مرضی سے کلمہ پڑھنا چاہ رہی ہوں، مجھ پر کسی قسم کا کوئی دباؤ نہیں ہے''۔

۱۸ر جنوری ۲۰۱۴ء کو جامعۃ العلوم الاسلامیہ علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کے دارالافتاء سے قبولیت اسلام کی سند حاصل کی اور اسلامی نام عائشہ رکھا۔

۲۰ر جنوری ۲۰۱۴ء کو عائشہ بی بی نے جناب منظور احمد میئو ایڈووکیٹ صاحب کی وساطت سے ہائی کورٹ میں ایک درخواست داخل کی کہ آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کی شق نمبر: ۲۰ اور ۱۵ کے تحت ہر پاکستانی کو مذہبی آزادی ہے، جیسا کہ لکھا ہے:

آرٹیکل: 20 مذہبی آزادی اور مذہبی ادارے قائم کرنا:

''ہر شہری کا بنیادی حق ہے کہ کوئی بھی مذہب اختیار کرے اور مذہبی آزادی سے اپنے مذہب کی تعلیمات حاصل کرے اور اس کا پرچار کرے''۔

اس آرٹیکل کی تفصیلات کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہبی آزادی ان کو حاصل ہے جو پاکستان کے آئین کی رو سے کسی نہ کسی مذہب میں داخل ہیں (البتہ ایک نام نہاد گروہ قادیانی، اس کی مستقل مذہبی حیثیت آئین پاکستان

www.banuri.edu.pk

میں تسلیم نہیں ہے، اس لیے آئین انہیں اپنی مذہبی رسوم کی اجازت تو دیتا ہے، مگر پرچار کا حق نہیں ہے۔)

آرٹیکل نمبر: ۱۵ میں ہے کہ ہر پاکستانی کو آزادی ہے کہ کہیں بھی جا کر رہے، پاکستان میں سفر کرے، رہائش اختیار کرے، وغیرہ۔

اس آئینی پٹیشن میں کہا گیا کہ درخواست گزار اسلامک ریپبلک آف پاکستان کی شہری ہے اور وہ ۲۶؍جون ۱۹۹۴ء کو ہندو خاندان میں پیدا ہوئی اور اس کے ثبوت کے طور پر اس نے اپنا پیدائشی سرٹیفکیٹ اور تعلیمی سرٹیفکیٹ پیش کیا، جس میں اس کی عمر ۲۰ سال کے قریب درج ہے اور اس نے ضلع سانگھڑ سے تعلیم حاصل کی۔ درخواست گزار نے یہ بھی لکھا کہ:

''میں اسلامی تعلیمات سے بہت زیادہ متأثر ہوئی ہوں اور میں نے مسلمان بچوں سے جو میرے پڑوسی اور اسکول میں پڑھتے تھے، ان سے قرآن پاک پڑھنا سیکھا اور میں نے اسلامی کتب اور اسلامی پروگرام .... دیکھ کر اسلام قبول کیا، جب میرے گھر والوں کو پتہ چلا کہ میں اسلامی تعلیمات میں دلچسپی لے رہی ہوں تو میری فیملی نے مجھے دھمکانا شروع کر دیا اور میرے بھائی نے اسلامی تعلیمات سیکھنے سے بالکل منع کر دیا اور میرے اوپر پابندی لگادی کہ آپ کوئی اسکول وکالج نہیں جاؤ گی اور اسلامی تعلیمات واسلامی باتوں پر عمل کرنے پر بھی پابندی لگادی اور کہا کہ آپ ہندوازم کی تعلیم حاصل کرو۔ تو درخواست گزار عائشہ (پوجا) نے اپنے بھائی کو منع کر دیا اور کہا کہ میں اسلام کے علاوہ کوئی بات نہیں کروں گی، تو یہ باتیں اس کے بھائی دلیپ کمار نے ہندو پنچائیت کمیٹی کے چیئر مین کو بتائیں تو ہندو پنچائیت کمیٹی کے چیئر مین نے دھمکیاں دیں کہ اسلامی تعلیمات بند کرو۔ درخواست میں کہا گیا ہے کہ بلاوجہ کی پابندیاں لگائی گئیں ہیں۔ درخواست گزار نے کہا کہ میں جوان ہوں، آئین کے تحت مجھے مذہبی آزادی ہے کہ میں اپنی مرضی سے جو بھی مذہب اختیار کروں، مجھے آئین پاکستان کی شق: ۲۰ اور ۱۵ کے تحت آزادی ہے۔ میں اپنی مرضی سے ہندو سے مسلمان ہوئی ہوں اور میں اپنی مرضی، خواہش اور پسند سے ۱۶؍جنوری ۲۰۱۴ء کو ضلع سانگھڑ سے گھر چھوڑ کر کراچی آئی ہوں۔ مجھے کسی نے نہ دھمکایا ہے، نہ کسی طریقے سے مجھے کسی نے ورغلایا ہے۔ میں نے اسلام قبول کرنے سے پہلے اپنی مرضی سے مجسٹریٹ کے سامنے اپنا بیان ریکارڈ کرایا ہے کہ اپنی مرضی، پسند اور خواہش سے اسلام قبول کر رہی ہوں اور میں نے جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں جا کر اسلام قبول کر کے اس کی سند حاصل کی ہے اور اسلام قبول کرنے کی سند بھی اس درخواست کے ساتھ منسلک ہے۔ مجھے کسی نے بھی نہ اغوا کیا ہے، نہ ورغلایا ہے اور نہ ہی اسلام قبول کرنے کے لیے کسی نے دھمکیاں دی ہیں۔ میرے بھائیوں کو اسلام قبول کرنے کا پتہ چل گیا ہے، وہ مجھے ہماری ہندو پنچائیت کمیٹی کے کہنے پر قتل کر دیں گے اور میرے بھائی اور ہندو پنچائیت کمیٹی کے لوگ بہت زیادہ بااثر ہیں اور S.H.O سانگھڑ، D.S.P سانگھڑ، D.I.G میر پور خاص اور ڈسٹرکٹ

پولیس آفیسر سانگھڑ سب ان ہندو پنچائیت کمیٹی کے دباؤ میں میرے خلاف جھوٹے مقدمے رجسٹر کرا کر سانگھڑ لے جا کر قتل کر دیں گے، لہٰذا آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کے آرٹیکل: ۲۰ اور ۱۵ کے تحت میرا حق ہے جو میں نے استعمال کیا ہے۔ میں نے کوئی غیر قانونی کام نہیں کیا ہے، لہٰذا مجھے آئین پاکستان ۱۹۷۳ء کے تحت تحفظ فراہم کیا جائے اور مجھے اسلامی تعلیمات حاصل کرنے سے نہ روکا جائے، اور پولیس افسران کو منع کیا جائے کہ مجھے کسی بھی جھوٹے مقدمے میں گرفتار نہ کریں۔''

اس آئینی پٹیشن کے داخل ہونے کے بعد عدالت کی طرف سے تمام متعلقہ اداروں کو جب ۲۴ رجنوری ۲۰۱۴ء کو نوٹس جاری ہوئے تو ہندوؤں نے ایک ہندو ایم این اے کی وساطت سے پورے سندھ میں جا بجا پریس کانفرنس کرنا شروع کر دیں اور مقامی مسلمانوں پر الزام لگایا کہ انہوں نے زبردستی اس بچی کو اغوا کیا ہوا ہے۔ ان ہندوؤں کو جب ہائی کورٹ کی طرف سے نوٹس ملے تو انہوں نے نامی گرامی وکلا کی خدمات حاصل کیں اور ضلع سانگھڑ کے ایس ایچ او نے کورٹ میں کہا کہ یہ لڑکی اغوا ہوئی ہے، اس کو برآمد کرنا ہے، اس کے اغوا کی ایف آئی آر ۲۱ رجنوری ۲۰۱۴ء کو کٹوائی گئی ہے، اس لڑکی کو برآمد کر کے سانگھڑ لے کر جانا ہے۔

جس پر ایڈووکیٹ جناب منظور احمد منو صاحب نے کورٹ کو بتلایا کہ لڑکی نے اپنی مرضی سے ذاتی طور پر ہائی کورٹ میں پیش ہو کر پٹیشن داخل کی اور اس نے کہا کہ: مجھے کسی نے اغوا نہیں کیا، میں اپنی مرضی سے آئی ہوں اور میں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے، یہ لوگ مجھے جان سے مار دیں گے۔ منظور صاحب نے کہا کہ: اگر بچی کا بیان لینا ہے تو مدرسہ جا کر پولیس اس کا بیان ریکارڈ کر سکتی ہے اور اس بیان کی روشنی میں مقدمہ کی تفتیش کی جائے۔ ہائی کورٹ نے پولیس کو آرڈر کیا کہ پولیس مدرسہ جا کر بچی کا بیان ریکارڈ کرے۔ پولیس نے بیان ریکارڈ کیا، بچی نے پولیس کو وہی بیان دیا جس کا ذکر اوپر آ چکا ہے، پولیس نے بچی کے اس بیان کی روشنی میں ہندوؤں کی طرف سے دائر کردہ ایف آئی آر اور اس مقدمہ کو جھوٹا قرار دے کر اس کی رپورٹ ہائی کورٹ میں داخل کرا دی۔

ہندوؤں کی طرف سے جھمت (jhamat) اور نریش کمار (naresh kumar)، وکیل پیش ہوئے اور کافی تعداد میں ہندو پنچائیت کمیٹی اور لڑکی کے والدین اور بھائی سب کورٹ میں آئے۔ ان کی طرف سے ہائی کورٹ میں اعتراض داخل کیے گئے کہ: ۱:...... یہ پٹیشن حیدرآباد میں فائل ہونی چاہیے تھی۔ ۲:...... پٹیشن داخل کرنے والی نابالغ ہے۔ ۳:...... اور کہا کہ لڑکی ۱۹۹۷ء میں پیدا ہوئی۔ ۴:...... جو سرٹیفکیٹ لڑکی نے کورٹ میں پیش کیے جس میں اس کی عمر ۲۰ سال لکھی ہوئی ہے، وہ سب ڈسٹرکٹ ایجوکیشن ڈیپارٹمنٹ نے کینسل کر دیئے ہیں، لہٰذا لڑکی کی عمر ۱۷ سال ہے، اس لیے اس کا کوئی بھی قانونی حق نہیں ہے۔ ۵:...... یونین کونسل سانگھڑ نے بھی پیدائشی سرٹیفکیٹ جو جاری کیا تھا، جس میں

تاریخ پیدائش ۱۹۹۶ء درج ہے، وہ بھی کینسل کردیا ہے۔ ٦:......لڑکی پیدائشی ہندو ہے اور اسے اسلام کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہے اور وہ گیتا، ایمایان اور مابھارت کی تعلیم حاصل کرتی ہے۔لڑکی نابالغ ہے، اس کو غیر قانونی مقاصد کے لیے اغوا کیا گیا اور اس کے ساتھ زنا کیا جارہا ہے اور اس کی F.I.R سانگھڑ تھانے میں زیر دفعہ 361,364A,366 تعزیراتِ پاکستان کے تحت درج ہے اور لڑکی نے غیر اخلاقی اور خطرناک جرم کیا ہے اور اس مقدمے میں لڑکی سے زبردستی دستخط کروائے گئے ہیں۔اسی طرح D.I.G میر پور خاص اور S.S.P سانگھڑ اور پولیس کی طرف سے جوابات داخل کیے گئے۔

۷رمئی ۲۰۱۴ء کو ہائی کورٹ کے جج نے حکم دیا کہ لڑکی کو کورٹ میں پیش کیا جائے، جس پر ایڈووکیٹ جناب منظور احمد مئو راجپوت صاحب نے اعتراض کرتے ہوئے جرح کے دوران جج صاحب کو بتایا کہ لڑکی اکیلی کورٹ میں پٹیشن داخل کرنے آئی، جس وقت وہ کورٹ آئی تھی تو لواحقین کو معلوم نہ تھا کہ لڑکی اس وقت ہائی کورٹ کی عمارت میں موجود ہے، اس لیے اس وقت لڑکی کو کوئی خطرہ نہیں تھا، چونکہ لڑکی کے خاندان کو اور ہندو پنچایت کمیٹی کے لوگوں کو معلوم ہوگیا ہے کہ لڑکی اب ہائی کورٹ میں آئے گی تو لڑکی کی جان کو انتہائی شدید خطرہ ہے،لڑکی کے بھائی اور ہندو پنچائیت وخاندان کے لوگ لڑکی پر قاتلانہ حملہ یا قتل یا اغوا وغیرہ کچھ بھی کرسکتے ہیں، اس لیے منظور احمد راجپوت صاحب نے یہ درخواست دی کہ لڑکی کو ۹رمئی ۲۰۱۴ء کو مدرسہ سے کمرۂ عدالت تک پولیس کی حفاظت اور اس کی نگرانی میں لایا جائے اور کورٹ اس سے خود معلومات حاصل کرے۔ جس پر ہائی کورٹ کے معزز جج صاحب نے آرڈر پاس کرتے ہوئے ایس ایچ او سائٹ تھانہ کو حکم دیا کہ پٹیشنر یعنی عائشہ کو مکمل تحفظ دیا جائے اور گیارہ مئی ۲۰۱۴ء کو عدالت میں پیش کیا جائے۔

گیارہ مئی ۲۰۱۴ء کو صبح نو بجے جناب جسٹس شہاب سرکی کی عدالت میں صبح ہی سے کورٹ روم میں عائشہ (پوجا) کے خاندان، ہندو پنچائیت اور دیگر ہندو تنظیموں کے لوگ اور اس کے دور دراز کے رشتہ دار بھی کمرۂ عدالت میں موجود تھے۔نو بجنے کے چند منٹ بعد پولیس کے مکمل تحفظ کے ساتھ عائشہ کو کورٹ میں پیش کرنے کے لیے لایا گیا تو منظور احمد مئو راجپوت ایڈووکیٹ صاحب نے عائشہ (پوجا) سے پوچھا کہ کوئی پریشانی تو نہیں؟ آپ آج یہاں سے پوجا بن کر جاؤ گی یا عائشہ ہی رہوگی؟ تو عائشہ کا پرسکون جواب تھا کہ:

''الحمد للہ عائشہ ہوں اور اگر خدانخواستہ آج میرے خاندان والوں نے مجھے ماردیا تو میرا جنازہ اور میری آخری رسومات مسلمان عقیدے کے مطابق ادا کی جائیں''۔

منظور احمد راجپوت ایڈووکیٹ صاحب لکھتے ہیں کہ میں عائشہ کے ان جملوں کی ادائیگی کے بعد انتہائی مطمئن اور پرمسرت تھا۔ساڑھے نو بجے کے قریب مقدمے کی سماعت کے لیے جج صاحب نے حکم دیا، سماعت کے چند لمحے بعد معزز عدالت نے حکم دیا کہ یہ جو بچی کٹہرے میں میرے سامنے کھڑی ہے،

اس سے کہو کہ اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں سے ملے، جس پر عائشہ نے اپنے خاندان کے لوگوں، عورتوں، بچوں اور ماں باپ سے کمرۂ عدالت میں ہی ملاقات کی۔

کیس کی سماعت کے دوران لڑکی کے بھائیوں کی طرف سے کچھ کاغذات کورٹ میں پیش کیے گئے، جس میں کہا گیا کہ پوجا کی عمر سترہ سال ہے، بیس سال نہیں ہے، اور وہاں کے ڈسٹرکٹ ایجوکیشن آف سانگھڑ کا جاری کردہ ایک عدد لیٹر بھی کورٹ کے سامنے پیش کیا گیا، جس کی تحریر تھی کہ عائشہ کا پہلا والا سرٹیفکیٹ مسترد کردیا گیا ہے، جس کے مطابق عائشہ کی عمر ۲۰ سال بنتی ہے، جبکہ اس کی اصل عمر ۱۷ سال ہے۔ اسی طرح پیدائشی سرٹیفکیٹ بھی سیکرٹری یونین کونسل سانگھڑ نے کینسل کردیا، لہٰذا بچی کی عمر پیش کردہ کاغذوں کے مطابق ۱۷ رسال ہے، نابالغ بچہ اسلام قبول نہیں کرسکتا اور نہ ہی اس کا آئینی طور پر حق حاصل مجاز ہے۔

جس پر منظور احمد راجپوت صاحب نے اپنی باری پر دلائل پیش کرتے ہوئے معزز عدالت کو بتایا کہ آئین پاکستان کی ۱۹۷۳ء کی شق نمبر: ۲۰ کے تحت ہر پاکستانی کو آئینی طور پر کسی بھی مذہب کو قبول کرنا، اس کا پرچار کرنا، ہر پاکستانی کا آئینی حق ہے اور اس میں عمر کی کوئی قید نہیں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آٹھ سال کی عمر میں اسلام قبول کیا اور مدینہ منورہ میں ایک یہودی بچہ نے چھوٹی عمر میں اسلام قبول کیا، صحیح بخاری کا حوالہ پیش کیا، اس کے علاوہ کتنے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں جنہوں نے بچپن میں اسلام قبول کیا۔ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین میں لکھا ہے کہ قرآن وسنت کے متصادم کوئی قانون نہیں بنے گا۔ لہٰذا آئین کے مطابق عائشہ نے باہوش وحواس درست اسلام قبول کیا۔ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے آئین کے مطابق عائشہ کا قانونی حق ہے کہ آئین پاکستان کی پاسداری کرتے ہوئے اس کی قانونی آزادی اور مذہبی آزادی کی حفاظت کی جائے۔

دو گھنٹے کی طویل بحث کے دوران عائشہ (پوجا) اپنے ماں باپ، بہن، بھائی اور دیگر اہل خانہ کے ساتھ بیٹھی رہی، عدالت نے حکم دیا کہ ایک گھنٹے کے بعد دوبارہ سماعت ہوگی۔

معزز جج صاحب کورٹ روم سے چیمبر میں چلے گئے۔ چیمبر میں جانے کے دس منٹ بعد جج صاحب نے عائشہ کو اکیلے اپنے چیمبر میں بلایا اور آدھے گھنٹے تک ملاقات کے بعد عائشہ چیمبر سے کورٹ روم میں واپس آ گئی، جہاں اس کے والدین و دیگر رشتہ دار موجود تھے۔ عائشہ نے اپنے وکیل منظور احمد راجپوت ایڈووکیٹ صاحب کو اپنے پاس بلایا اور کہا کہ: مجھے پانی پلا دیجئے، تو اس کے لیے فوراً پانی کا بندوبست کیا گیا۔ اس دوران عائشہ کے ایک بھائی اور ماں نے کہا کہ ہم آپ کو جوس اور پانی پیش کررہے ہیں، یہ پی لو، جس پر عائشہ نے کہا کہ: ''میں مسلمان ہوں اور مسلمان کے ہاتھ سے ہی پانی پیوں گی''، جس پر عائشہ کی ماں نے کافی واویلا کیا، جس پر کورٹ کے اہلکاروں اور پولیس نے تنبیہ کی کہ یہ کمرۂ عدالت ہے، اس کے تقدس کا خیال کیا جائے۔

تقریباً آدھے گھنٹے بعد معزز جج صاحب واپس کمرۂ عدالت میں آئے اور عدالتی کارروائی شروع ہوئی اور معزز عدالت نے حکم جاری کیا کہ:

’’عمر کا تعین کرنا آئینی پٹیشن میں یا اس عدالت کے دائرہ اختیار میں نہیں۔ اور کہا کہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ۱۹۷۳ء کے آئین کے مطابق شق نمبر: ۲۰ کے تحت مذہبی آزادی ہر پاکستانی کا بنیادی حق ہے اور جو دستاویزات ہندو برادری کی طرف سے پیش کی گئی ہیں، یہ ایک ہندو ایم این اے کی طرف سے اپنے علاقے کے لوگوں پر دباؤ کی بنیاد پر تیار کی گئی ہیں، کیونکہ ان کا دباؤ مختلف اداروں پر ہوتا ہے، لہٰذا آرٹیکل: ۱۹۹ کی سب شق نمبر: ۲ کے تحت ان دستاویزات کی کوئی حیثیت نہیں ہے اور یہ عائشہ کا بنیادی حق ہے، اس بات سے قطع نظر کہ عائشہ کی عمر ۱۷ سال ہے یا بیس سال ہے، یہ اس کا آئینی اور بنیادی حق ہے۔

اور معزز جج صاحب نے اپنے فیصلے میں یہ بھی لکھا کہ لڑکی کو میں نے چیمبر میں بلایا، اس سے مختلف سوالات کیے کہ کیا آپ واپس اپنے خاندان میں جانا چاہتی ہو؟ اس نے جواب دیا کہ میں نے بغیر کسی دباؤ کے اسلام قبول کیا ہے، اور جج صاحب نے اپنے ریمارکس میں لکھا ہے کہ میں نے عائشہ سے بہت سارے اسلام کے متعلق سوالات کیے تو عائشہ نے تمام اسلامی سوالوں کے جواب اعتماد کے ساتھ اور درست دیئے اور کہا کہ میں اپنی خوشی سے جامعہ بنوریہ مدرسہ میں بڑے سکون سے دین اسلام کی تعلیم حاصل کررہی ہوں، جہاں اور بہت ساری بچیاں بھی دین کی تعلیم حاصل کررہی ہیں اور جج صاحب نے کہا کہ ہم آپ کو اگر کچھ دنوں کے لیے دارالامان بھیج دیں تو جواب میں عائشہ نے کہا: میں اسلامی تعلیم حاصل کررہی ہوں، اور اسلامی طریقے سے رہ رہی ہوں اور اپنی زندگی بلاخوف وخطر گزار رہی ہوں، لہٰذا جج صاحب نے اپنے حکم میں لکھا کہ لڑکی نے اسلام اپنی مرضی سے بغیر کسی دباؤ کے قبول کیا ہے اور وہ کہتی ہے کہ میں دوبارہ اپنے والدین کے ساتھ ان کے گھر نہیں جانا چاہتی اور مدرسے میں ہی رہوں گی۔

جج صاحب نے اپنے حکم میں مزید تحریر کیا کہ: ’’عائشہ مدرسے میں ہی تعلیم حاصل کرے گی اور پاکستان میں موجود تمام محکمے عائشہ کو تحفظ فراہم کرنے کے پابند ہوں گے، کوئی عائشہ کو اسلام قبول کرنے کے بارے میں ہراساں نہیں کرے گا۔‘‘

اور عائشہ کی ماں کو کہا گیا کہ آپ جب بھی چاہیں عائشہ سے ملاقات کے لیے مدرسہ میں جاسکتی ہیں۔ مدرسے میں کوئی بھی شخص عائشہ کو مار پیٹ اور بدتمیزی سے پیش نہیں آئے گا۔ عائشہ کے خاندان والوں کی طرف سے اگر کوئی ایسا وقوعہ ہوا تو اس کے خلاف عدالت سخت قانونی کارروائی کرے گی۔ مقدمے کا فیصلہ عائشہ (جن کا سابقہ نام پوجا بائی تھا) کے حق میں تحریر کیا گیا، عائشہ کو واپس جامعہ بنوریہ سائٹ' پولیس کے تحفظ کے ساتھ روانہ کردیا گیا۔ الحمد للہ!

حضرت اقدس مولانا سید محمد اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی رحلت

دار العلوم دیوبند کے قدیم فاضل و سابق مدرس، شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے تلمیذ خاص، شاگرد رشید اور سفر وحضر کے خادم، ماہنامہ بینات کراچی کے ابتدائی دور کے معاون مدیر، شیخ المشائخ حضرت مولانا سیّد محمد اصلح الحسینیؒ ۷ر شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ مطابق ۶ رجون ۲۰۱۴ء بروز جمعہ اس دنیائے فانی میں ایک صدی رہنے کے بعد داعیِ اجل کو لبیک کہتے ہوئے راہیِ عالم عقبیٰ ہوگئے۔ إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون. إن للّٰہ ما أخذ ولہ ما أعطی وکل شیئ عندہٗ بأجل مسمٰی۔

حضرت مولانا سیّد محمد اصلح الحسینیؒ کو اللہ تبارک وتعالیٰ نے گونا گوں صفات سے متصف فرمایا تھا۔ آپ جید عالم، بہترین ادیب، ماہر انساب، کہنہ مشق سیاستدان اور سب سے بڑھ کر حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے سلسلہ کو آگے بڑھانے والے اور آپ کے انداز واطوار پر مضبوطی سے عمل پیرا اور آپ کی روایات کے امین ومحافظ تھے۔ یہی وجہ تھی کہ شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی نور اللہ مرقدہٗ کے فرزندانِ ارجمند فدائے ملت حضرت مولانا سیّد محمد اسعد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد حضرت مولانا سیّد محمد ارشد مدنی حفظہ اللہ جب بھی پاکستان تشریف لاتے تو حضرت مولانا سیّد محمد اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی زیارت و ملاقات کے لئے ان کے ہاں ضرور تشریف لے جاتے، بلکہ ایسا بھی ہوا کہ کراچی آمد کی غرض ہی صرف چند اشخاص کی زیارت وملاقات ہوتی تھی، جن میں سے حضرت مولانا قاری شریف احمد اور حضرت مولانا سیّد محمد اصلح الحسینی نور اللہ مرقدہما ایسے بزرگوں کے اسمائے گرامی نمایاں ہیں۔ راقم الحروف کو بھی ان بزرگوں کی معیت میں ایک دو بار حضرت کے گھر جانا اور آپ کی زیارت کرنا نصیب ہوا۔ حضرت مرحوم کا وجود با مسعود اہل پاکستان اور خصوصاً اہل کراچی کے لئے اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے ایک انعام تھا۔ یہی شخصیات ہوتی ہیں جن کی دعاؤں کی برکت اور دعائے سحر گاہی سے بلائیں دور ہوتی ہیں، ان کے وجود کی برکت سے اہل زمین بہت ساری افتادوں اور آزمائشوں سے بچے رہتے ہیں۔

حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ ۲۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۵ ردسمبر ۱۹۱۳ء پنجشنبہ کو سادات زیدیہ کی بستی گلاؤٹھی ضلع بلند شہر میں حضرت مولانا سیّد محمد صالحؒ کے ہاں پیدا ہوئے، ننھیال نے ''محمد اصلح''، اور منجھلے دادا سیّد احمد حسنؒ نے ''آلِ حسن'' نام رکھا۔

آپ نے ابتدائی تعلیم سے موقوف علیہ تک اپنے آبائی مدرسہ ''منبع العلوم'' گلاؤٹھی (جس کی بنیاد دار العلوم دیوبند سے دو سال قبل رکھی گئی تھی) میں پڑھا۔ قرآن مجید حضرت حافظ بہادر خان

پرتاب گڑھیؒ جیسے مشہور استاد سے پڑھا اور درجہ کتب میں حضرت مولانا شبیر احمد خانؒ جیسے حضرات آپ کے اساتذہ میں شامل ہیں۔

قریباً ۱۹۲۷ء تک آپ نے ''منبع العلوم'' میں پڑھا۔ اس کے بعد مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں تقریباً تین سال رہ کر بعض فنون اور عصری علوم حاصل کئے۔ ۱۹۳۰ء کا بھی کچھ حصہ وہیں گزارا، اس کے بعد آپ دارالعلوم دیوبند آ گئے اور قریباً ۱۹۳۳ء میں وہاں سے فراغت حاصل کی، مگر فراغت کے بعد بھی کچھ عرصہ دیوبند اور دہلی میں گزارا اور قریباً ۱۹۳۵ء تک وہیں رہے۔ ۱۹۳۵ء میں فتح پوری سے ''مولوی فاضل'' بھی کیا۔ دارالعلوم دیوبند میں آپ کے اساتذۂ گرامی میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سیّد حسین احمد مدنی قدس سرہٗ (م: ۱۳/ ۵/ ۱۳۷۷ھ تا ۱۷/ ۹/ ۱۹۵۷ء)، حضرت مولانا سیّد اصغر حسین المعروف میاں جی قدس سرہٗ (م: ۲۲/۱/۱۳۶۴ھ)، حضرت مولانا ابراہیم بلیاوی قدس سرہٗ (م: ۲۴/ ۹/ ۱۳۸۷ھ)، حضرت مولانا رسول خان ہزاروی قدس سرہٗ (م: ۳/ ۹/ ۱۳۹۱ھ)، حضرت مولانا اعزاز علی امروہوی قدس سرہٗ (م: ۱۳۴۴ھ)، حضرت مولانا مفتی ریاض الدین بجنوری قدس سرہٗ (م: ۲۲/۱۲/ ۱۳۶۲ھ) شامل ہیں۔

قریباً ۱۹۳۶ء میں آپ دہلی سے بھوپال تشریف لے گئے، وہاں ان دنوں نواب حمید اللہ خان کا دور تھا اور قاضی محمد حسین مراد آبادیؒ قاضی القضاۃ اور نواب کے اتالیق تھے۔ قاضی محمد حسن مراد آبادیؒ نے ''شینی قصاص'' کے سلسلہ میں حضرت مفتی کفایت اللہ دہلوی رحمۃ اللہ علیہ سے اور آپ سے رجوع کیا اور اس کے بعد آپ کا انتخاب ''علماء کونسل بھوپال'' کے رکن کے طور پر کر لیا گیا۔

علماء کونسل بھوپال میں بڑے کہنہ مشق اور پختۂ کار علماء رکنیت رکھتے تھے۔ کچھ عرصہ وہاں ٹھہرنے کے بعد بوجوہ آپ وہاں سے بہاول پور چلے گئے۔ انہی دنوں آپ نے منشی فاضل اور ادیب فاضل کا امتحان بھی دیا۔ ۱۹۳۷ء کے آخر میں ایک مرتبہ پھر آپ دہلی آئے اور حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ترغیب سے دہلی میں قیام کا فیصلہ کیا۔ آپ ایک اچھے مضمون نویس اور اداریہ نگار کے طور پر شہرت رکھتے تھے اور اس سے پہلے ''مجلس قاسم المعارف'' دیوبند ''استقلال'' دیوبند اور ''گل فروش'' میں کام کر چکے تھے اور اب یہاں آپ نے حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہفت روزہ ''الجمعیۃ'' میں بطور ایڈیٹر اور ''مؤتمر المصنفین'' اور ''ندوۃ المصنفین'' میں بطور مؤلف اور مترجم کام کیا۔ دسمبر ۱۹۳۸ء کے آخر تک آپ نے وہیں قیام کیا، یہاں تک کہ ''الجمعیۃ'' کی ضمانت ضبط ہوگئی اور اخبار بند ہوگیا۔

دسمبر ۱۹۳۸ء میں الجمعیۃ دہلی کی ضمانت ضبط ہونے کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن سجادؒ

نائب امیر شریعت بہار نے آپ کو ہفت روزہ ’’الہلال‘‘ باقی پور پٹنہ کی ادارت کے لئے پٹنہ آنے کی دعوت دی۔ آپ پٹنہ چلے گئے اور تقریباً ۱۹۴۰ء تک آپ پٹنہ میں رہے۔ ’’الہلال‘‘ جب قریباً ۱۹۴۰ء میں بند ہوگیا تو آپ وہاں سے لاہور چلے گئے۔ ’’زمزم‘‘ لاہور اور اس کے بعد ’’مدینہ‘‘ بجنور میں بھی کچھ عرصہ کام کیا، یہ قریباً ۴۰۔۱۹۴۱ء کا زمانہ تھا۔

قریباً ۱۹۴۱ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ دارالعلوم دیوبند میں بطور ’’فارسی مدرس‘‘ تدریس کرتے رہے۔ فروری ۱۹۴۸ء میں آپ کو مجبوراً پاکستان آنا پڑا، چند ماہ ٹھہرنے کے بعد آپ واپس چلے گئے، مگر جولائی ۱۹۴۸ء میں پھر پاکستان آنا پڑا اور ۱۵؍ جولائی ۱۹۴۸ء میں پرمٹ لگ جانے کی وجہ سے آپ کی واپسی نہ ہوسکی، یہاں قیام کرنے کے بعد آپ کچھ عرصہ عربی لینگویج کی کلاسز کو تعلیم دیتے رہے۔ کچھ عرصہ مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے ’’ادارہ شرقیہ‘‘ میں بھی کام کیا۔ حضرت مولانا سیّد محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ سے دیرینہ تعلقات اور ان کی خواہش پر آپ نے ۶۴-۱۹۶۵ء کے عرصہ میں ماہنامہ ’’بینات‘‘ میں بھی کچھ عرصہ کام کیا۔ اور ۷۹-۱۹۸۰ء کے عرصہ میں ’’دار التصنیف‘‘، تبلیغی کالج سے بھی منسلک رہے۔ ۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان میں ملازمت ہوگئی۔ آپ کی اس ۳۲ سالہ ملازمت کے دوران آپ اسلامی موضوعات پر لیکچرز بھی دیتے تھے اور عربی، فارسی، براڈ کاسٹنگ کے اپنے فرائض منصبی بھی ادا کرتے رہے۔

پاکستان میں رہتے ہوئے آپ نے علمی وسیاسی حوالوں سے زیادہ روحانی حوالوں کی طرف توجہ فرمائی۔ پاکستان آنے کے بعد اگرچہ آپ نے علمی و سیاسی معاملات کو از سرنو شروع کرنے کے لئے کوشش کی، مگر ’’بینات‘‘ اور ’’دارالتصنیف‘‘ کے علاوہ کہیں باقاعدہ بات نہ بن سکی۔

حضرت مولانا اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی جہد ومشقت، مجاہدہ و جفاکشی اور صبر آزمائی سے عبارت رہی، جو حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ کی حیات طیبہ کی کامل تصویر ہے۔ حضرتؒ کی نماز جنازہ ۶؍ جون ۲۰۱۴ء بروز جمعہ بعد نماز مغرب جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن میں حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے ایک اور نامور شاگرد رشید حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی صاحب مدظلہٗ نے پڑھائی۔ کثیر تعداد میں علماء وطلبہ نے شرکت کی۔ قارئین ’’بینات‘‘ اور ’’نسبت مدنیہ‘‘ کے عقیدت مندوں سے دعاءِ مغفرت اور ایصالِ ثواب کی درخواست ہے، **أللّٰھم اغفر لہٗ وارحمہ۔**

وصلی اللّٰہ تعالیٰ علیٰ خیر خلقہ سیدنا محمد وعلیٰ آلہ وصحبہ أجمعین

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

www.banuri.edu.pk

دینِ اسلام سے مسلمانوں کی روگردانی

محدث العصر علامہ سید محمد یوسف بنوری رحمۃ اللہ علیہ

حق تعالیٰ کی ان تمام نعمتوں میں جو اس دنیا کو عطا کی گئی ہیں، صرف ''دینِ اسلام'' نعمتِ عظمیٰ ہے۔ امتِ محمدیہ علی صاحبہا الصلوات والتحیات والتسلیمات کو اس نعمت سے سرفراز فرمایا گیا ہے۔ جس طرح حضرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ''ختمِ نبوت'' اور ''سیادتِ انبیاء'' اور رسل کی نعمتِ کبریٰ سے مشرف کیا گیا اور تمام انبیاء کرام علیہم السلام کی جماعت میں اعلیٰ ترین منصب پر فائز کیا گیا، اسی طرح کتبِ الٰہیہ میں ''قرآن حکیم'' اعلیٰ ترین کتاب ان پر نازل فرمائی گئی اور ظاہر ہے جس امت میں خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جیسے رسول ہوں اور قرآن حکیم جیسی کتاب موجود ہو اور ان دونوں سرچشموں سے جس دین کا خمیر تیار ہوا ہو، وہ دین بھی اعلیٰ ترین دین ہوگا تو ہر حیثیت سے ''دینِ اسلام'' اعلیٰ ترین ہوا اور اس امت کے ذریعہ تمام کائنات کو یہ اعلیٰ ترین نعمت دی گئی ہے اور اسی لیے وحی آسمانی الٰہی ابدی میں یہ اعلان کیا گیا ہے:

''اَلْیَوْمَ أَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ وَرَضِیْتُ لَکُمُ الْإِسْلَامَ دِیْنًا''۔ (المائدۃ)

''میں نے آج کے دن تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کردیا ہے اور اپنا احسان بھی پورا کردیا ہے اور صرف اسلام کو تمہارے لیے دین پسند کیا ہے''۔

اور ساتھ ہی یہ بھی اعلان کردیا گیا:

''وَمَنْ یَّبْتَغِ غَیْرَ الْإِسْلَامِ دِیْنًا فَلَنْ یُّقْبَلَ مِنْهُ وَهُوَ فِی الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِیْنَ''۔ (آل عمران)

ترجمہ:..... ''اور جو کوئی اسلام کو چھوڑ کر اور کوئی دین اختیار کرے گا وہ ہرگز قبول نہ ہوگا اور وہ آخرت میں تباہ و برباد ہوگا''۔

حضرت رسالت پناہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی ارشاد فرمایا: ''**لو کان موسیٰ حیًا لما وسعه إلا اتباعی**'' .... ''اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام (جیسے اولوالعزم پیغمبر) بھی زندہ ہوتے تو میرا ہی اتباع کرتے اور اس کے سوا چارۂ کار نہ ہوتا''۔

اور ظاہر ہے کہ آفتابِ عالم تاب کے طلوع کے بعد تاروں کی روشنی تلاش کرنا یا چراغوں سے

www.banuri.edu.pk

نور حاصل کرنا انتہائی غیر معقول حرکت ہے۔ لیکن وائے محرومی اتنی بڑی نعمت کے ہوتے بھی آج مسلمان اس کو چھوڑ کر یورپ اور امریکہ و برطانیہ سے روشنی تلاش کررہے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کی اس نعمتِ عظمیٰ، اس نعمتِ کبریٰ کی کتنی بڑی توہین ہے۔ اگر دینِ موسوی اور دینِ عیسوی مسیحی اپنی اصلی شکل میں محفوظ بھی ہوتے اور اس پر دنیا عمل بھی کرتی ہوتی تب بھی اسلام آنے کے بعد اس کی طرف توجہ کرنا اسلام کی بڑی تحقیر ہوتی اور جبکہ یہ ادیان تمام تر ''تحریف'' کی نذر ہوچکے ہیں، کوئی آسمانی چیز ان میں محفوظ نہیں رہی، پھر بھی اس کی پیروی بجز ضلالت وحماقت کے اور کیا ہوسکتی ہے؟! معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہوجاتا، مسلمان نہ صرف دینی شعائر، بلکہ وہ غیر دینی معاشرت کی چیزیں بھی اس قوم سے لے کر اپنا رہے ہیں، جس پر حق تعالیٰ کا غضب نازل ہوچکا ہے۔ حضرات انبیاء کرام علیہم السلام کی زبانی ان پر لعنت نازل ہوچکی ہے، پھر کاش کہ معاملہ یہیں تک محدود ہوتا، مسلمان قوم نے تو اپنی تمام اسلامی خصوصیات کو یک قلم چھوڑ دیا اور زندگی کے تمام ہی شعبوں میں ان کافروں کی نقالی شروع کررکھی ہے، لباس، پوشاک، خوراک، سونا جاگنا، چلنا پھرنا، دفتری نظام، گھریلو نظام، تعلیم کا نظام، حتیٰ کہ تمام کے تمام طرزِ معیشت ومعاشرت میں ان کی حیرت انگیز نقالی کو اپنے لیے سرمایۂ سعادت وفخر سمجھ لیا ہے، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

اس سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی نعمتوں کی کیا تحقیر وتذلیل ہوگی؟ فسق وفجور، لہو ولہب، تفریح وعیاشی میں بھی ایسی تقلید کہ عقل حیران ہے، فحاشی وعریانی، فواحش ومنکرات میں انہماک اس درجہ ترقی پر ہے کہ نقل اصل سے بڑھ گئی، یہ تو ہو مسلمانوں کی زندگی اور یہ ہو ان کی تہذیب ومعاشرت، اس پر انتہائی بے حیائی سے یہ پوچھا جاتا ہے کہ ہم کیوں ذلیل ہیں؟ کیوں خوار ہیں؟ کیوں روز بروز قعرِ مذلت میں گرتے چلے جارہے ہیں؟

باقی یہ کہنا کہ یورپ پر عذابِ الٰہی کیوں نہیں آتا؟ اول تو یہ نظر کا فرق ہے: ''**وإن جھنم لمحیطة بالکافرین**'' وہ یقیناً جہنم کے شعلوں میں جل رہے ہیں، ان کے ملک قہرِ الٰہی کی آگ میں پھک رہے ہیں، جس عذاب میں یورپ مبتلا ہے، الامان والحفیظ۔ قلب کا سکون جو زندگی کی اصلی روح ہے وہ یورپین ممالک میں سراسر ختم ہوچکا ہے۔ تقویٰ وطہارت کی زندگی سے جو قلوب میں نورانیت وطمانیت پیدا ہوتی ہے وہ یکسر ختم ہے، وہ انتہائی حیران وپریشان ہیں، قلب کو منشیات ومسکرات کے استعمال سے عارضی آرام پہنچانے کی کوشش وکاوش میں اپنی زندگیاں ختم کررہے ہیں، گویا قانون کی گرفت سے بچ کر خودکشی کررہے ہیں۔ ان ممالک کی تفصیلات اگر ذرا بھی کسی کو معلوم ہوجائیں تو معلوم ہو کہ وہاں پوری زندگی جہنم بن چکی ہے اور اس سے پناہ مانگی جائے اور اگر کسی کو اس نمائشی چہل پہل اور تروتازگی پر کچھ شبہ ہو اور وہ قصداً حقائق سے چشم پوشی کرے تو اس کو یہ سمجھنا چاہیے کہ یہ قومیں حق تعالیٰ کے محبوب دین ''اسلام'' سے منکر ومنحرف اور کافر ہیں۔ حق تعالیٰ کے قانون عدل کا تقاضا یہ ہے کہ جب آخرت کی نعمتوں سے ایک قوم سراسر محروم ہو تو دنیا کی نعمتیں تو اسے ملنی چاہئیں، یہی قرآن کہتا ہے، یہی حدیث کہتی ہے۔

دینِ اسلام سے بغاوت اور اس کی سزا

سزا تو باغی قوم کو ملتی ہے، مسلمانوں نے تو اسلام قبول کیا ہے اور پھر اسلام کو چھوڑا ہے جس کے دو ہی محمل ہو سکتے ہیں یا تو وہ باغی ہیں یا منافق ہیں، بغاوت کا جرم بھی انتہائی سخت ہے اور نفاق کا جرم بھی انتہائی شدید ہے، اسی لیے قرآن کریم میں منافقین کے لیے جہنم کا آخری اور سب سے نچلا طبقہ تجویز کیا گیا ہے، گویا کفار سے بہت زیادہ سخت عذاب ان کو ہوگا۔ آج مسلمان قوم بھی یا تو عملی بغاوت میں مبتلا ہے یا پھر شدید نفاق کا شکار ہے۔ بہر حال کہنا یہ ہے کہ مسلمان قوم نے حق تعالیٰ کی نعمتِ عظمیٰ کی شدید تحقیر کی ہے جو یقیناً نا قابلِ برداشت جرم ہے، یہ حق تعالیٰ کے دین کا استخفاف، یہ توہین، اتنا بڑا جرم ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ حلیم نہ ہوتے اور ان کا حلم کارفرما نہ ہوتا تو ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو روئے زمین پر رہنے نہ دیا جاتا اور اس صفحۂ ہستی سے اس قوم کا نام ونشان تک مٹ جاتا۔

بلادِ عربیہ کو دیکھئے! حق تعالیٰ نے ان کو دنیا کی بھی عظیم نعمت نصیب فرمائی، دنیا کے کلیدی مقامات ان کے ہاتھوں میں ہیں، زمینی خزانے ان کے دروازوں پر بہا دیئے ہیں، یورپ وامریکہ ان کے محتاج ہیں، لیکن خالقِ کائنات کی نعمت ''اسلام'' سے انحراف اور دنیا کے سامانِ تعیش میں انہاک کی وجہ سے کس بری طرح یورپ کی گندی زندگی کی نقالی میں مبتلا ہیں اور چھانٹ چھانٹ کر تمام یورپین معاشرے اور تہذیب کی جو غلاظتیں ہیں ان کو اختیار کر رکھا ہے اور حیرت ہے کہ ان کی محنتیں، مشقتیں، جفاکشی وفرض شناسی وغیرہ جو بعض خوبیاں ہیں، ان کو یکسر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ آخر سب عذابِ الٰہی میں مبتلا ہو گئے ہیں، باوجود عددی کثرت کے قلت میں ہیں، باوجود اسبابِ عزت کی فراوانی کے ذلت میں ہیں، باوجود ثروت وغنا کے فقر وتنگ دستی میں مبتلا ہیں، صرف اس لیے کہ تمام دولت وثروت عیش پرستی وراحت کوشی کے نذر ہو رہی ہے، تازہ بتازہ نیو ماڈل کاروں، یورپین طرز کی عمارتوں اور فرنیچر وسامانِ آرائش میں سارا سرمایہ جھونکا جا رہا ہے، پیرس کو مات کرنے والے ہوٹل اور کلب روز افزوں ہیں، افرنجیت کا ایک بھوت ہے جو دماغوں پر سوار ہو گیا ہے، انہی کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں، انہی کے کانوں سے سنتے ہیں، آخر اس کا نتیجہ یہی ہوا نا کہ کروڑوں افراد پر مشتمل عرب آبادی چند مٹھی بھر یہودیوں سے لرزہ براندام ہے۔ مانا کہ یہودی طاقت کے پیچھے امریکہ اور روس کی طاقت ہے، لیکن اگر یہی مسلمان آج حق تعالیٰ کی نصرت پر یقین رکھتے اور آسمانی ہدایات پر عمل پیرا ہوتے تو آج نقشہ ہی کوئی اور ہوتا اور یہ روزِ بد نہ دیکھنا پڑتا۔ کون سی تنبیہ ہے جو قرآن حکیم نے نہیں کی اور کون سی نصیحت ہے جو خدا اور رسول نے نہیں کی، لیکن اس سے استفادہ کے لیے گوشِ عبرت نیوش اور نگاہِ بصیرت افروز چاہیے۔ اگر مسلمان قوم کو اب بھی عبرت نہیں ہوتی اور یہی خدا فراموش زندگی ہے، یہی بے حیائی ہے، یہی عریانی ہے، یہی اسراف وتبذیر کی شیطانی زندگی ہے، تو خاکم بدہن انہیں اپنی آخری تباہی وبربادی کا انتظام کرنا چاہیے۔ حق تعالیٰ رحمۃ للعالمین کے طفیل اپنی رحمتِ کاملہ سے اپنے عذاب سے بچالے اور ہمیں اپنی اصلاح کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

اسلام کا قانونِ جنگ

امن و عافیت کا ضامن!

مولانا رفیع الدین حنیف قاسمی

اسلام کا قانونِ جنگ جسے اصطلاحِ شرع میں ''جہاد فی سبیل اللہ'' کے نام سے موسوم کیا گیا ہے، کچھ تو خود ہماری بداطواریوں، اوچھی ونامناسب حرکات وسکنات، اور ہوش سے زیادہ جوش وجذباتیت کے اظہار، دوسری جانب اعداء اسلام کی سازشوں، افواہوں اور غلط پروپیگنڈوں اوران کی جانب سے اس کی غلط توضیح وتشریح، اس کے حقیقی مفہوم کو پردۂ خفا میں رکھنے کی وجہ سے، معاشرہ کی اصلاح، امنِ عامہ کے قیام اور سماج سے ظلم وسفاکیت اور فساد و بگاڑ کے دور کرنے میں اس کا حقیقی اور بامعنی کردار نگاہوں سے اوجھل ہوتا جارہا ہے۔

ذرائع ابلاغ اور پروپیگنڈے کے اس دور میں ایک حقیقی مسلمان کی یہ ذمہ داری بنتی ہے کہ وہ مختلف ذرائع تشہیر کے ذریعے اسلامی احکام وتعلیمات کے روشن اور تابناک پہلوؤں کا اظہار کرتا رہے، تاکہ رفتارِ زمانہ اور خود مسلمانوں کی غفلت اور نادانی کے نتیجے میں' اسلامی تعلیمات کی خوبیوں پر گردوغبار کی جو دبیز تہہ جم چکی ہے اس کی صفائی ہو، اور اسلامی تعلیمات کا حقیقی، روشن وتابناک چہرہ لوگوں کے سامنے آئے، جس کا ایک نقد فائدہ تو یہ ہوگا کہ اغیار واجانب کی غلط فہمیوں پر مبنی نظریات وتصورات کا خاتمہ ہوگا، دوسری جانب ان کے حلقہ بگوشِ اسلام ہونے کی راہیں کھلیں گی۔ یہ تحریر اسی تناظر میں ضبطِ تحریر میں لائی جارہی ہے کہ اسلامی قانونِ جنگ کے مختلف محاسن سامنے آئیں اور غلط وباطل نظریات ومفروضات کا ازالہ ہو۔ اگرچہ مذہب اسلام سراپا خیر ورحمت ہے، لیکن مطلب پرستوں، نفسانیت کے پجاریوں اور عدل وانصاف کے قاتلوں کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ وہ حذف واضافہ اور ردوبدل کے ذریعے کسی بھی عبادت کے حقیقی مفہوم کو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل کرکے اس سے اپنا معنی ومطلوب کشید کرلیں، جس میں وہ ماہر ہوتے ہیں۔

چونکہ اس وقت اسلام کا نظریۂ جنگ اقوامِ عالم کی آنکھوں کا کانٹا بنا ہوا ہے، وہ تعصب اور جانب داری کی عینک اپنی آنکھوں پر چڑھائے ہوئے عمداً اور باتکلف اسلام کے قانونِ جنگ کو دوسرا رنگ وآہنگ دینے پر تلے ہوئے ہیں، چونکہ وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ اسلام کا حقیقی، صاف وروشن چہرہ لوگوں کے

سامنے ہوگا تو اس سے ان کی چودھراہٹ اور سرداری خطرہ کی زد میں آجائے گی؛ اس لیے یہ لوگ مختلف عنوانات سے اسلام کے چمکدار اور تابناک اور بلند و بالا سورج پر تھوکنے کی احمقانہ کوشش کرتے رہتے ہیں۔

جنگ علی الاطلاق ممنوع نہیں

اللہ عزوجل نے انسان کو مجموعۂ اضداد بنایا ہے، خیر وشر دونوں پہلو انسانی طبیعت میں ودیعت کیے ہیں، انسان میں خیر کا پہلو اُسے نیکی اور بھلائی پر ابھارتا ہے، جب کہ شر کا پہلو اُسے آمادۂ معصیت اور ظلم وستم کرتا ہے؛ اس لیے روزِ اول ہی سے اللہ عزوجل کا یہ قانون رہا ہے کہ وہ مختلف قوموں کو آمادۂ پیکار کیے رہتے ہیں، تاکہ اس طرح نیکی اور بھلائی کا پلڑا بھاری ہوجائے، سچائی وصداقت کی حقانیت آشکارا اور برائی کی قباحت وشناعت بھی عیاں ہوجائے۔ چنانچہ دنیا میں حق وصداقت کے غلبہ اور برتری اور شر وفساد کے خاتمہ کے لیے مختلف قوموں کے درمیان آویزش وٹکراؤ کے اپنے اسی ازلی قانون وروایت کا تذکرہ کرتے ہوئے اللہ عزوجل نے یوں ارشاد فرمایا: ''جو اپنے گھروں سے بے وجہ نکالے گئے محض اتنی بات پر کہ وہ یوں کہتے ہیں کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اگر یہ بات نہ ہوتی کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کا ایک دوسرے سے زور نہ گھٹواتا رہتا تو نصاریٰ کے عبادت خانے اور یہود کے عبادت خانے اور وہ مسجدیں جن میں اللہ کا نام بکثرت لیا جاتا ہے سب منہدم ہوگئے ہوتے، بے شک اللہ تعالیٰ اس کی مدد کرے گا جو اللہ (کے دین) کی مدد کرے گا، بے شک اللہ تعالیٰ قوت والا، غلبہ والا ہے، وہ جس کو چاہے غلبہ دے سکتا ہے''۔

مذکورہ بالا آیت میں مسلمانوں کو جو قتال کی اجازت دی گئی ہے، وہ نہایت ہی ناگزیر حالت میں ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ مسلمانوں کو یہ جنگ کی اجازت اس لیے نہیں دی گئی ہے کہ وہ زمین میں فساد وبگاڑ کریں، بلکہ اس جنگ کی اجازت کا مقصد یہ ہے کہ وہ جملہ مذاہب کی آزادی کو قائم رکھیں، بدامنی اور انارکی کا خاتمہ کریں، پارسیوں، عیسائیوں، یہودیوں کی عبادت گاہوں اور مسلمانوں کی مساجد کو ہر طرح کے نقصانات اور گزند سے مامون ومحفوظ رکھیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قتال اور جہاد کا حکم کوئی نیا حکم نہیں۔ پچھلے انبیاء علیہم السلام اور ان کی امتوں کو بھی قتالِ کفار کے احکام دیئے گئے ہیں اور اگر ایسا نہ کیا جاتا تو کسی مذہب اور دین کی خیر نہ تھی، سارے ہی دین ومذہب اور ان کی عبادت گاہیں مسمار کردی جاتیں۔

اسلام میں جہاد کا حقیقی مفہوم

جہاد سے متعلق سب سے پہلی غلط فہمی یہ ہوتی ہے کہ اس لفظ کو ''جنگ'' کے معنی میں لیا جاتا ہے اور اُسے عربی لفظ ''حرب'' کے مرادف باور کیا جاتا ہے جو تباہی وبربادی کے معنی میں آتا ہے۔ (المعجم الوسیط :١٤٦) یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے کہیں بھی اپنے اسلامی نظریۂ جنگ کے لیے لفظ ''حرب'' کا استعمال نہیں کیا ہے۔ قابلِ التفات امر یہ ہے کہ جس ملت ومذہب ہی کے نام میں امن وعافیت کا مفہوم شامل ہو' وہ کیوں کر بے جا کُشت وخون اور فساد وبگاڑ کی دعوت دے سکتا ہے؟! بلکہ دین' دنیا میں آیا ہی اس لیے ہے کہ اس قسم

کی ظلم وفساد پر مشتمل جنگوں کا خاتمہ کرے اور امن وامان اور عدل ومساوات پر قائم ایک ایسا نظریۂ جنگ اقوامِ عالم کے سامنے پیش کرے کہ دورانِ جنگ بھی کسی کی حق تلفی یا اس پر ظلم وستم جائز نہ ہو، چنانچہ مذکورہ بالا لغت میں لفظ ''جہاد'' کی تشریح یوں کی گئی ہے: ''**قتال من لیس لھم ذمة من الکفار**''....یعنی ''غیر ذمیوں سے قتال''۔ (المعجم الوسیط)

اسلامی جنگ کا مقصود فتنہ وفساد کا خاتمہ

اسلام میں جنگ ایک نہایت شریف عمل ہے، لہٰذا ہمیں اس کے متعلق کسی طرح کے بھید بھاؤ یا معذرت خواہانہ رویہ کے اختیار کرنے کی ضرورت ہرگز نہیں ہے۔ اس کے بعد یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام ایک آفاقی اور عالمگیر مذہب ہے، اس کی تعلیمات دیگر مذاہب کی طرح محض چند رسوم وعقائد کا مجموعہ نہیں ہے اور نہ ہی یہ انسان کا خود ساختہ اپنے ہاتھوں بنایا ہوا قانون ودستور ہے؛ بلکہ خالقِ کائنات کا نازل کردہ نظامِ حیات ہے، جس میں ہر شعبۂ زندگی کے متعلق انسانیت کے لیے رہنمایانہ اصول بتلائے گئے ہیں، یہی وجہ ہے کہ اس کی تعلیمات کو ہر شخص اپنا سکتا ہے، کوئی بھی شخص ان اصول کو اپنا کر اس کے دامن رحمت وعافیت میں جگہ پا سکتا ہے۔ ''اسلامی نظامِ جنگ''، ''جہاد'' یا اس جیسی نقل وحرکت کا مقصود بھی یہی ہے کہ فطرتِ انسانی سے موزون اعتدال پر مبنی ان تعلیمات کا ہر سمت بول بالا ہو، روئے زمین سے ناانصافی، بدامنی، ظلم وجبر اور شر وفساد کا خاتمہ ہو اور ہر شخص آزادی کے ساتھ اس خدائی نظام کے تحت امن وسکون کے ساتھ زندگی گزار سکے۔ اشاعتِ اسلام کا ہرگز یہ مقصود نہیں کہ لوگوں کو مجبور کر کے اسلام میں داخل کیا جائے، ارشادِ خداوندی ہے: ''لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ''......''دین میں زور زبردستی نہیں۔'' اگر کوئی شخص جزیہ کی مشروعیت پر غور کرے گا تو یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اسلامی جنگ کا مقصود اسلام کا غلبہ ہے، خواہ وہ مخالف کے اسلام لانے سے ہو یا رعیت بن کر رہنا منظور کرنے سے۔ چوں کہ جزیہ دے کر اسلامی سلطنت میں رہنا بھی دراصل اسلامی قانون کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہے، جب اسلام کو غلبہ حاصل ہو چکا تو فتنہ وفساد کے امکانات بھی ختم ہو چکے؛ لہٰذا اب جنگ بھی موقوف کر دی جائے گی، اب اس ذمی شخص کو اسلامی سلطنت میں وہ تمام حقوق حاصل ہوں گے جو ایک مسلمان کو حاصل ہوتے ہیں۔ اسی کو آیت کریمہ میں یوں بیان کیا گیا ہے: ''اور ان کے ساتھ اس حد تک لڑو کہ فساد نہ رہے اور دین (غلبہ) اللہ ہی کا ہو جاوے۔ اور اگر وہ لوگ (فساد سے) باز آ جاویں تو سختی کسی پر نہیں ہوا کرتی بجز بے انصافی کرنے والوں کے''۔ (البقرۃ:۱۹۳) اس آیت کریمہ میں جنگ بندی کی انتہا فتنہ وفساد کا خاتمہ بتایا گیا ہے۔

دورِ رسالت کے غزوات وسرایا کی مجموعی تعداد ۸۲ ہے۔ اگر ان لڑائیوں کو جارحانہ اور اقدامی تسلیم کیا جائے تو بھی ان میں مقتولین کی مجموعی تعداد ۱۰۱۸ (ایک ہزار اٹھارہ) ہے اور ۸۲ (بیاسی) پر ان کو تقسیم کرنے سے فی جنگ 12.414 (بارہ اعشاریہ چار سو چودہ) اوسط نکلتا ہے۔ قیدیوں کی مجموعی

تعداد ۶۵۶۴ (چھ ہزار پانچ سو چونسٹھ) ہے جو جزیرہ نما عرب کی وسعت کے مقابلہ میں ہیچ ہے اور چوں کہ ان کی تعداد کے اندر بڑی تعداد ۶۰۰۰ (چھ ہزار) ایک ہی غزوہ حنین کی ہے (جو کہ بعد میں تمام آزاد کر دیے گئے) اس لیے باقی جنگوں میں اسیرانِ جنگ کا اوسط ۷ (سات) رہتا ہے۔ اس کے بالمقابل زمانۂ گزشتہ کی دو عظیم جنگیں اور ان کی ہلاکت خیزیوں اور تباہیوں کا اندازہ لگایئے جو صرف چھوٹی سلطنتوں کو آزاد کرانے کی غرض سے لڑی گئی تھیں۔ مقتولین، مجروحین کی تعداد ساٹھ ستر لاکھ سے متجاوز ہے۔ اہلِ دنیا کی لڑائیوں کا ذکر چھوڑو، مقدسین کی لڑائیاں لو، مہابھارت کے مقتولین کی تعداد کروڑوں سے کم نہیں۔ یورپ کی مقدس مذہبی انجمنوں نے جس قدر نفوس ہلاک کیے، ان کی تعداد لاکھوں سے متجاوز ہے۔ (تمام اعداد وشمار کے لیے ملاحظہ ہو: رحمۃ للعالمین، ج:۲،ص:۴۶۴)

جزیہ کی ادائیگی کو بھی جو کہ دراصل اسلامی تعلیمات کی بالادستی اور روئے زمین پر فتنہ وفساد مچانے سے رکنے کا اعتراف اور عہد ہوتا ہے، اس کو بھی جنگ بندی کی انتہا بتلایا گیا ہے۔ اللہ عزوجل کا ارشادِ گرامی ہے: ''اہلِ کتاب جو کہ نہ خدا پر (پورا پورا) ایمان رکھتے ہیں اور نہ قیامت کے دن پر اور نہ ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جن کو خدا تعالیٰ نے اور اس کے رسول (ﷺ) نے حرام بتلایا ہے اور نہ سچے دین (اسلام) کو قبول کرتے ہیں، ان سے یہاں تک لڑو کہ وہ ماتحت ہوکر اور رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کریں''۔ (التوبۃ:۲۹)

جزیہ کہتے ہیں اس مال کو جو اسلامی سلطنت کے ماتحت رہنے والے غیر مسلموں سے ان کی جان، مال، عزت وآبرو کی حفاظت کے لیے لیا جاتا ہے اور بالکل معمولی رقم ہوتی ہے۔ جزیہ کی یہ رقم ادا کرنے والے یہ لوگ ذمی کہلاتے ہیں اور ان کے اسلامی سلطنت کے باشندے ہونے کی حیثیت سے ان کے جان ومال، عزت وآبرو کی حفاظت اسلامی حکومت کے ذمہ ہوتی ہے، ان کے مذہبی امور میں مداخلت کو اسلام منع کرتا ہے، پھر اس میں بچے، بوڑھے، عورتیں اور معذورین سے جزیہ نہیں لیا جاتا، اسی طرح مکاتب، مدبر، ام الولد پر بھی جزیہ نہیں ہوتا، مذہبی پیشوا جو گوشہ نشیں ہوں ان سے بھی جزیہ نہیں لیا جاتا۔ (اصح السیر،ص:۴۷۴)

دورانِ جنگ بے قصور لوگوں سے تعرض کی ممانعت

اسلامی قانونِ جنگ کا ایک حسین اور خوبصورت پہلو یہ بھی ہے کہ اس نے دورانِ جنگ بے قصور، نہتے اور کمزور لوگوں کے قتل کی سختی سے ممانعت کی ہے، عملاً جن لوگوں نے جنگ میں حصہ لیا ہے یا جنہوں نے مشوروں اور خدمات کے ذریعے ان کو مدد بہم پہنچائی ہے، یہی لوگ قتل کے مستحق ہوں گے، بقیہ بچوں، عورتوں، بوڑھوں اور خلوت نشیں عابدوں اور زاہدوں سے ہرگز تعرض نہ کیا جاتا۔ دورانِ جنگ بے قصور لوگوں کے قتل کو تو رہنے دیجیے، اسلام نے سرسبز وشاداب کھیتوں، پھل دار درختوں اور باغات کو بھی نقصان پہنچانے سے روکا ہے۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے فرمایا: ''کمزور بوڑھوں،

چھوٹے بچوں اور عورتوں کو قتل نہ کیا جائے۔'' (ابوداؤد، باب دعوۃ المشرکین إلی الإسلام، حدیث: ۸۴۹)

اور ایک روایت میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے ایک لشکر کو جو ملکِ شام ایک مہم کے لیے روانہ ہوا تھا، اُنہیں اس قسم کی ہدایات دی تھیں کہ وہ بچوں کو قتل نہ کریں، کسی عورت پر ہاتھ نہ اٹھائیں، کسی ضعیف بوڑھے کو نہ ماریں، کوئی پھلدار درخت نہ کاٹیں، کسی باغ کو نہ جلائیں۔ (مؤطا مالک: ۱۶۸)

یہ بات پیشِ نظر رہے کہ عہدِ نبوی میں آنحضرت ﷺ نے جہاں کہیں بھی کسی آبادی کو نرغے میں لیا ہے، وہاں کی ساری آبادی اور قبیلے کے سارے لوگ بنفسِ نفیس اور عملاً جنگ میں شریک تھے؛ البتہ عہدِ صحابہؓ میں عموماً مسلمانوں کا مقابلہ وہاں کی آبادی سے نہیں، بلکہ حکومت کے منظّم فوجیوں سے ہوا ہے؛ اس لیے مجاہدین نے اس ملک میں فاتحانہ داخل ہونے کے بعد وہاں کی عوامی املاک یا وہاں کے باشندوں کے مال وجان پر کسی طرح کی دست درازی نہیں کی ہے، بلکہ وہاں کے مقامی لوگوں نے مسلمانوں کے حسنِ سلوک اور رواداری اور انصاف پر مبنی طرزِ عمل کو دیکھ کر کئی موقعوں پر اپنے ہم مذہب عیسائیوں اور پارسیوں کے خلاف ہی جاسوسی، خبر رسانی اور رسد بہم پہنچانے اور اس قسم کی مختلف طرح سے امداد کی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ جنگِ یرموک پیش آنے کے وقت جب مسلمان شہر حمص سے نکلے تو یہودیوں نے توریت ہاتھ میں لے کر کہا: ''جب تک ہم زندہ ہیں کبھی رومی یہاں نہ آنے پائیں گے''۔ عیسائیوں نے نہایت حسرت سے کہا: ''خدا کی قسم! تم رومیوں کی بہ نسبت کہیں بڑھ کر ہم کو محبوب ہو''۔ (الفاروق، ج:۲، ص:۱۲۰)

غور طلب امر یہ ہے کہ اگر اسلامی جنگ کا مقصود کشیدگی اور بدامنی اور انارکی کا ازالہ اور وہاں عدل وانصاف پر مبنی طرزِ حکومت کا قیام نہ ہوتا تو وہاں کے مقامی باشندے اپنے ہم مذہب پیشواؤں کے خلاف مسلمانوں کا ساتھ کیوں دیتے؟ اور ان کے ساتھ اس جذباتی محبت وعقیدت کا اظہار کیوں کرتے؟

معاہدے کی پاسداری کی تاکید

اسلام نے حالتِ جنگ میں جن چیزوں کی سخت تاکید کی ہے، ان میں سے ایک عہد کی پاسداری بھی ہے، بلکہ عام حالات میں بھی وفائے عہد کو ایک مسلمان کے لیے اس کے ایمان کا لازمہ اور خاصہ قرار دیا گیا ہے: ''ایک ایمان والے کے شایانِ شان نہیں کہ وہ وعدہ خلافی یا عہد شکنی کرے، بدعہدی یہ تو منافق کا شیوہ ہوتا ہے۔'' (ریاض الصالحین: ۲۹۳)

عہد وپیمان کے پاس ولحاظ کی تاکید کرتے ہوئے اللہ عز وجل نے یوں ارشاد فرمایا: ''معاہدے کی پاسداری کرو؛ کیوں کہ اس کے تعلق سے باز پرس ہوگی''۔ عام حالات میں پابندیٔ عہد کا اس قدر سختی کے ساتھ اسلام مطالبہ کرتا ہے، ظاہر ہے کہ جنگ کی حالت میں اس کی اہمیت مزید دوچند ہو جاتی ہے، اس لیے خصوصاً دورانِ جنگ یہ تاکید کی گئی ہے کہ دشمن خواہ بدعہدی کیوں نہ کرے، مسلمانوں کے لیے ہرگز یہ اجازت نہیں کہ قبل از اطلاع ان کی جانب پیش قدمی کریں یا بغیر انقطاعِ عہد کی اطلاع کے ان پر چڑھ

دوڑیں؛ بلکہ ان کی جانب سے عہد شکنی کے باوجود بھی مسلمانوں کے لیے یہ ضروری قرار دیا گیا ہے کہ وہ پہلے صاف اور صریح الفاظ میں معاہدہ کے خاتمہ کا اعلان کردیں، پھر اس کے بعد ہی وہ جنگی کارروائی کرسکتے ہیں۔ ارشادِ خداوندی ہے: ''اور اگر تجھ کو ڈر ہو کسی قسم سے دغا کا تو پھینک دے ان کا عہد ان کی طرف ایسی طرح پر کہ ہو جاؤ تم اور وہ برابر، بیشک اللہ کو خوش نہیں آتے دغاباز۔'' (الانفال: ۵۸)

اس آیت کریمہ میں قانون کی ایک اہم دفعہ بتلائی گئی ہے جس میں معاہدہ کی پابندی کی خاص اہمیت کے ساتھ یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ اگر کسی وقت معاہدہ کے دوسرے فریق کی طرف سے خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہوجائے تو یہ ضروری نہیں کہ ہم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھیں؛ لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدہ کو صاف طور پر ختم کردینے سے پہلے ہم ان کے خلاف کوئی اقدام کریں، بلکہ صحیح صورت یہ ہے کہ ان کو اطمینان وفرصت کی حالت میں اس سے آگاہ کردیا جائے کہ تمہاری بدنیتی یا خلاف ورزی ہم پر ظاہر ہوچکی ہے، یا یہ کہ تمہارے معاملات مشتبہ نظر آتے ہیں؛ اس لیے ہم آئندہ اس معاہدہ کے پابند نہیں رہیں گے، تم کو بھی ہر طرح اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو!۔

اس سلسلہ کا ایک دلچسپ اور مشہور واقعہ جس کا ذکر مفتی محمد شفیع صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا ہے:

حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا ایک قوم کے ساتھ ایک میعاد کے لیے التوائے جنگ کا معاہدہ تھا، حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے ارادہ فرمایا کہ اس معاہدہ کے ایام میں اپنا لشکر اور سامان جنگ اس قوم کے قریب پہنچا دیں، تاکہ معاہدہ کی میعاد ختم ہوتے ہی وہ دشمن پر ٹوٹ پڑیں، مگر عین اس وقت جب حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا لشکر اس طرف روانہ ہو رہا تھا، یہ دیکھا گیا کہ ایک معمر آدمی گھوڑے پر سوار بڑے زور سے یہ نعرہ لگا رہا ہے: ''ألله أكبر ألله أكبر وفاءً لا غدرًا''، یعنی نعرۂ تکبیر کے ساتھ یہ کہا کہ ہم کو معاہدہ پورا کرنا چاہیے، اس کی خلاف ورزی نہ کرنا چاہیے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ جس قوم سے کوئی صلح یا ترکِ جنگ کا معاہدہ ہوجائے تو چاہیے کہ ان کے خلاف نہ کوئی گرہ کھولیں اور نہ باندھیں۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کو اس کی خبر کی گئی، دیکھا تو یہ کہنے والے بزرگ حضرت عمرو بن عنبسہ صحابی رضی اللہ عنہ تھے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوراً اپنی فوج کو واپسی کا حکم دے دیا، تاکہ التوائے جنگ کی میعاد میں لشکر کشی پر اقدام کرکے خیانت میں داخل نہ ہو جائیں''۔ (معارف القرآن، ج:۴، ص:۲۷۰)

اسیرانِ جنگ کے ساتھ رحم وکرم کا معاملہ

دنیا میں جتنی قومیں اور سلطنتیں گزری ہیں، وہ اسیرانِ جنگ کے ساتھ نہایت ہی وحشیانہ اور بہیمانہ سلوک کرتے تھے۔ موجودہ یورپین حملہ آور اقوام کا جنگی قیدیوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک ان کے اسیرانِ جنگ کے ساتھ سلوک کے حوالے سے شاہدِ عدل ہے۔ گوانتانا موبے اور ابوغریب کی بدنامِ زمانہ جیل اور وہاں کی انسانیت سوز اور حیاباختہ انواعِ تعذیب وعقوبت کو دیکھ کر ہر شخص تلملا اٹھا، اس کے ساتھ اسلام کا اسیرانِ جنگ کے ساتھ حسنِ سلوک بھی مشاہدہ کرتے چلیے:

''جنگ بدر کے۷۲ (بہتر) قیدیوں میں آنحضرت ﷺ نے ۷۰ (ستر) قیدیوں کو جرمانہ لے کر آزاد فرمادیا تھا۔ ان قیدیوں کو دورانِ اسارت مہمانوں کی طرح رکھا گیا، اہلِ مدینہ نے ان کے ساتھ نہایت ہی اچھا برتاؤ کیا، اپنے بچوں سے بڑھ کر ان کی خاطر مدارات کی۔ ایک دفعہ آنحضرت ﷺ کو بدر کے قیدیوں کی بندش کے تنگ ہونے کی وجہ سے کراہنے کی آوازیں سنائی دیں، آنحضرت ﷺ کو ان کی اس تکلیف کی وجہ سے ساری رات نیند نہ آئی، جب آپ ﷺ کے حکم سے تمام قیدیوں کی بندش ڈھیلی کی گئی، تب آپ ﷺ کو راحت ہوئی۔ بدر کے تمام قیدیوں میں سے صرف دو شخص (عقبہ بن مُعیط اور نضر بن حارث ان کے بھیانک جرائم کی وجہ سے) قتل کر دیے گئے۔ جنگ بدر کے بعد غزوۂ بنی مصطلق میں بھی (۱۰۰) سے زیادہ مرد وزن قید ہوئے، آپ ﷺ نے ان سب کو بلا کسی شرط اور جرمانہ کے آزاد کردیا۔ جنگ حنین کے موقع سے بھی چھ ہزار مرد وزن قیدیوں کو بلا کسی شرط ومعاوضہ کے آزاد فرمادیا، بلکہ بعض اسیروں کی آزادی کا معاوضہ آپ ﷺ نے اسیر کنندگان کو خود ادا کیا، پھر اکثر اسیروں کو خلعت اور انعام سے نواز کر رخصت کیا۔ ان جملہ نظائر سے اسلام کے حملہ آور دشمنوں اور قابو یافتہ قیدیوں کے ساتھ حسنِ سلوک اور رحم وکرم کا اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے۔ آنحضرت ﷺ کی پاک تعلیمات ہی کا نتیجہ تھا کہ خلفائے راشدین رضی اللہ عنہم کے عہد میں جب کہ عراق، مصر، شام، ایران اور خراسان، جیسے بڑے اور متمدن علاقے فتح ہوئے، لیکن کسی بھی جگہ حملہ آور یا جنگ آزما رعایا میں سے کسی کو لونڈی، غلام بنانے کا ذکر نہیں ملتا، بلکہ مغلوب دشمن سے تاوانِ جنگ لینے کا ذکر بھی درج نہیں ہے۔ (رحمۃ للعالمین، ج:۱، ص:۲۱۲)

مذکورہ بالا تحریر کی روشنی میں یہ بات بخوبی واضح ہوجاتی ہے کہ اسلام کا قانونِ جنگ امن وعافیت کا ضامن ہے۔ سسکتی، بلکتی اور تڑپتی انسانیت کو اگر کوئی جائے پناہ اور موقع نجات مل سکتا ہے تو اسلامی تعلیمات کے زیرِ اثر، ورنہ یہ خوف اور اندیشوں کے سائے انسانیت کا یوں ہی پیچھا کرتے رہیں گے۔

(بشکریہ: ماہنامہ دارالعلوم، دیوبند، ماہ ربیع الثانی ۱۴۳۵ھ)

مولانا محمد بلال بربری

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی فقہی تربیت

اور اُس کے نتائج وثمرات (تیسری قسط)

مولانا ڈاکٹر محمد عبدالحلیم چشتی

رسول ﷺ کا اپنی رائے کی بجائے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی رائے سے اتفاق

''إن الأمر لما ضاق على المسلمين فی حرب الأحزاب، وکان فی الکفار قوم من أهل مكة عوناً لهم رئيسهم عيينة بن حصن الفزاری، أبوسفيان بن حرب، بعث رسول الله ﷺ إلٰى عيينة وقال: ارجع أنت و قومک ولک ثلث: ثمار المدينة، فأبٰى إلَّا أن يعطيه نصفَها فاستشار فی ذلک الأنصارَ و فيهم سعد بن معاذ و سعد بن عبادة رئيسا الأوس والخزرج ، فقالا: هذا شئ أمرک الله به أم شئ رأيته من نفسک؟ قال: لا، بل رأيی رأيته من عند نفسی، فقالا: يا رسول اللهِ! لم ينالوا من ثمار المدينة إلابشراء أو بقرى فإذا أعزنا اللّٰه بالإسلام لا نعطيهم الدنيئة، فليس بيننا و بينهم إلَّا السيف، و فرح بذلک رسول الله ﷺ ثم قال للذين جاؤوا بالصلح: اذهبوا فلا نعطيهم إلا السيف''۔(۱)

''غزوۂ احزاب میں مسلمانوں پر جب جنگ کا معاملہ پریشان کن ہوگیا اور کفار (کے لشکر) میں مکہ کے لوگوں کی ایک جماعت ان کی معاونت کررہی تھی، ان کے سردار عیینہ بن حصن اور ابوسفیان بن حرب تھے تو رسول اللہ ﷺ نے عیینہ کے پاس (ایک قاصد) بھیجا اور فرمایا: تو اور تیری قوم (کفار کی نصرت و مدد چھوڑ کر) مکہ لوٹ جائے تو تمہارے لیے مدینہ کے پھلوں کا تیسرا حصہ ہوگا تو اس نے صاف انکار کردیا، مگر یہ کہ آپ ہمیں آدھے پھل دیں تو آنحضرت ﷺ نے اس معاملے میں انصار سے مشورہ کیا اور ان میں قبیلہ اوس وخزرج کے سردار حضرت سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ اور سعد بن عبادہ رضی اللہ عنہ بھی تھے تو ان دونوں نے حضور ﷺ سے پوچھا: اس بات کا حکم اللہ تعالیٰ نے دیا ہے یا یہ آپ کی ذاتی رائے ہے؟ رسالت مآب ﷺ نے فرمایا: نہیں، بلکہ یہ میری اپنی رائے ہے۔ تو انہوں نے عرض کیا: یا رسول اللہ! ان مکہ والوں کو خرید وفروخت اور مہمانداری کے علاوہ مدینہ کے پھل نہیں ملے، پھر جب اللہ تعالیٰ نے ہمیں اسلام کی بدولت عزت عطا فرمائی ہے تو ہم ان کو گئی گزری چیز بھی نہیں دیں گے،

ہمارے اوران کے درمیان میں (فیصلہ کن چیز) صرف تلوار ہے، رسول اللہ ﷺ (ان کی) اس بات سے مسرور ہوئے، پھران کی طرف سے صلح کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے کہا: جاؤ! اب تو ہم ان کا تلوار ہی سے فیصلہ کریں گے۔''

رائے کے استعمال پر اظہارِ مسرت

ایک حدیث میں ہے:

''عن رجال من أصحاب معاذؓ: أنّ رسول اللّٰه ﷺ لـمّا بعثه إلٰی الیمن، قال: کیف تقضی؟ قال: بکتاب اللّٰه عزّوجل، قال: فإن لم تجد فی کتاب اللّٰه؟ فقال: بسنّة رسول اللّٰه ﷺ، قال: فإن لم یکن فی سنة رسول اللّٰه ؟ قال: أجتهد برأیي، فقال: الحمد لِلّٰه الذی وَفَّقَ رسولَ رسولِ اللّٰه ﷺ لِما یُحبّهُ رسولُ اللّٰه ﷺ، فأجاز له الاجتهادَ فیما لا نصّ فیه. ومن جهة أخریٰ أنّ هذا الخبر قدتلقّاه النّاس بالقبول واستفاض، واشتهر عندهم من غیر نکیرمن أحدٍ منهم علی رواته، ولا ردَّ له وأیضًا: فإن أکثر أحواله أن یصیر مرسلا، والمرسل عندنا مقبول ''۔(۲)

'' حضرت معاذ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: رسول اللہ ﷺ نے انہیں جب یمن کی طرف (قاضی بناکر) بھیجا تو پوچھا: (جب تمہارے سامنے کوئی مسئلہ آئے گا) کیسے فیصلہ کروگے؟ عرض کیا: کتاب اللہ کے موافق۔ رسول اللہ ﷺ نے پوچھا: اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ؟ عرض کیا:! رسول اللہ ﷺ کی سنت کے موافق۔ سرکار دوعالم ﷺ نے پھر پوچھا: اگر سنت رسول اللہؐ میں نہ ملے؟ عرض کیا: اپنی رائے واجتہاد سے فیصلہ کروں گا۔تو سرورکونین ﷺ نے فرمایا: تمام تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے رسول اللہ ﷺ کے رسول وسفیرکوایسی چیز کی توفیق عنایت فرمائی جس کواللہ کا رسول ﷺ پسند کرتا ہے۔اس سے ثابت ہوتا ہے کہ رسالت مآب ﷺ نے ان کوغیرمنصوص مسائل میں اجتہاد کی اجازت عطا کی تھی،اس حدیث کوعوام وخواص میں قبول عام حاصل ہے اوراہلِ علم کے یہاں اس حدیث کو بغیرکسی انکارورد کے شہرت حاصل ہے۔ نیز (یہ بات بھی ملحوظ خاطر رہے کہ) بیشتر راویوں نے اس حدیث کومرسل روایت کیا ہےاورمرسل ہمارے (حنفیہ کے) یہاں مقبول اورقابلِ حجت ہے۔''

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے ارشاد''أجتهد برأیي'' کی تشریح صحیح البخاری وسنن ابی داؤد کے اولین شارح امام ابوسلیمان الخطابی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۳۸۸ھ نے ان الفاظ میں کی ہے:

''قال الخطابی: أجتهد برأیي یرید الإجتهادَ فی رد القضیة من طریق القیاس إلٰی معنی الکتاب والسنة ولم یرد الرأی الذی یسنح له من قبل نفسه أویخطر بباله من غیرأصل من کتاب أوسنّة وفی هذا إثبات القیاس وإیجاب الحکم به''۔ (۳)

یعنی ''أجتهد برأيي '' سے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مراد وہ اجتہاد ہے جس میں قیاس کے ذریعہ غیر منصوص مسئلے کے حکم کو قرآن وسنت کے معنی ومنشأ کی طرف لوٹایا جائے، نہ کہ اس رائے کی طرف جو محض نفسانی خواہش کی بنا پر ظاہر ہو، یا وہ رائے جو قرآن وسنت کی اصل کے بغیر یوں ہی دل میں کھٹکنے لگے۔ یہ حدیث قیاس کے ثبوت کی دلیل ہے، نیز اس امر کی دلیل ہے کہ قیاس جو حکم ثابت کرتا ہے اس پر عمل کرنا ضروری اور واجب ہے۔''

فقہاء محدثین میں حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۷۷۴ھ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی مذکورہ بالا حدیث کے مأخذ وسند کے متعلق فرماتے ہیں: ''**هذا الحديث في المسند والسنن بإسناد جيد** ''۔(۴)

.......یعنی ''یہ حدیث مسند احمد اور سنن کی کتابوں میں عمدہ سند کے ساتھ آئی ہے۔''

فقہی بصیرت سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی آراستگی

اکثر و بیشتر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس صفت سے آراستہ تھے اور اس صفت کے اصل مصداق رسول ﷺ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ہیں، چنانچہ شیخ الاسلام ابواسحاق شیرازی شافعی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۴۷۶ھ ''**طبقات الفقهاء**'' میں رقم طراز ہیں، جس کا ترجمہ یہ ہے:

''اس حقیقت کو سمجھو کہ رسول اللہ ﷺ کے اکثر و بیشتر صحابیؓ جنہوں نے ان کی صحبت اٹھائی اور ان سے وابستہ رہے، وہ سب فقیہ ہیں اور بلاشبہ یہ فقہ (شریعت کو سمجھنے سمجھانے) کا طریقہ صحابہ رضی اللہ عنہم کے حق میں آیا ہے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے خطاب (اوامر ونواہی) اور اس کے رسول ﷺ کے خطاب سے جو کچھ سمجھا اور رسول اکرم ﷺ کے افعال واعمال اور تقریرات (معرض بیان میں آپ ﷺ کے سکوت کرنے اور نکیر نہ کرنے) کو جانا اور سمجھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کا خطاب ہے۔ وہی قرآن کریم ہے جو انہی کی زبان میں ہے۔ ان اسباب کی وجہ سے جنہیں یہ جانتے اور ان واقعات کے تحت جو ان کے سامنے پیش آئے تھے یہ ان سے واقف تھے' اتارا گیا۔ انہوں نے نوشتۂ وحی کو سمجھا، اس کے منشأ ومطلب کو سمجھنے کی کوشش کی اور اس کے صریح اور غیر صریح احکام کو سمجھا۔ ابوعبید قاسم بن سلام رحمۃ اللہ علیہ (المتوفی ۲۲۴ھ) نے ''**كتاب المجاز** '' میں کہا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی صحابیؓ سے منقول نہیں کہ اس نے قرآن کی کسی صریح وصاف بات کو سمجھنے میں رسول اللہ ﷺ سے رجوع کیا ہو۔ رسول اللہ ﷺ کا خطاب ان سے انہی کی زبان میں ہوتا تھا، وہ اس کے معانی ومطالب کو جانتے، اس کی مبہم بات کو سمجھتے تھے، اس کے مقصد کو سمجھنے کی کوشش کرتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کے وہ افعال جن کا تعلق عبادات، معاملات، عادات و اطوار اور سیاسیات سے ہے، ان سب کا انہوں نے مشاہدہ کیا، دیکھا، اور سمجھا تھا۔ اور جو باتیں ان کے سامنے بار بار آتی تھیں ان کی گہرائی تک پہنچتے تھے، اس لیے رسول اللہ ﷺ نے ان کے متعلق فرمایا تھا: ''**أصحابي كالنجوم بأيهم اقتديتم اهتديتم**'' (میرے صحابہ رضی اللہ عنہم ستاروں کی طرح رہنما ہیں، تم

جس کی پیروی کروگے رہنمائی پاؤ گے) اس لیے جو کوئی رسول اللہ ﷺ کے ان اقوال میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم نے نقل کیے ہیں' غور وفکر کرے گا اور ان اعمال میں جن کا تعلق عبادات وغیرہ سے ہے نقل کرے گا، وہ ان کے علم و دانش، فہم وفراست اور فضل وکمال کی طرف اپنے آپ کو مجبور ومحتاج پائے گا، یہ اور بات ہے کہ ان اکثر و بیشتر صحابہ رضی اللہ عنہم میں وہ صحابہ رضی اللہ عنہم جنہیں فتویٰ دینے، حلال وحرام سے بحث کرنے (اور مشکل مسئلوں کا حل نکالنے) میں شہرت حاصل تھی، وہ ایک مخصوص جماعت تھی۔''(۵)

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی تعداد

عہدِ رسالت میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کل تعداد ایک لاکھ چودہ ہزار تھی۔(۶) ان میں اکثر و بیشتر فقیہ تھے، لیکن ہر ایک صحابیؓ مجتہد نہ تھا اور نہ وہ اپنے آپ کو فتویٰ دینے کا اہل سمجھتا اور نہ اسلامی معاشرے میں اس کو اس اہم ذمہ داری کا اہل سمجھا جاتا تھا۔

مجتہدین صحابہ کرام رضی اللہ عنہم

اوپر تصریح گزر گئی ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم کی مذکورہ بالا تعداد میں وہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم جن سے بکثرت فتویٰ منقول ہیں، ایسے کل سات مجتہد صحابیؓ ہیں۔ اور جن سے کم فتوے منقول ہیں، وہ تیرہ مجتہد صحابیؓ ہیں۔ اور جن سے کم تر صرف ایک دو فتوے منقول ہیں، وہ ایک سو بیس ہیں۔ اگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی کل تعداد میں صرف سات ہی سر برآوردہ مجتہدین کو شمار کیا جائے تو اس کا مطلب یہ نکلے گا کہ سولہ ہزار دو سو پچاسی صحابہ رضی اللہ عنہم کی عظیم جماعت میں صرف ہمیں ایک ہی عظیم ترین مجتہد نظر آتا ہے۔

اور اگر ان تیرہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو جن کے فتوے کم منقول ہیں، ان سات عظیم ترین مجتہد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ جن سے بکثرت فتوے منقول ہیں' ملائیں تو ان عظیم ترین اور عظیم تر سب کی تعداد بیس ہو جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ پانچ ہزار سات سو کی جماعت میں ہمیں ایک مجتہد ملتا ہے۔

مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات

علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۴۵۶ھ نے عہدِ صحابہؓ میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات بیان کیے ہیں، وہ فرماتے ہیں:

''لم ترووا الفتيا في العبادات والأحكام إلّا عن مائة ونيف وثلاثين منهم فقط من رجل و امرأة بعد التقصي الشديدة ''۔(۷)

''عبادات اور ایسے مسائل میں جن میں شریعت کا حکم درکار ہوتا ہے، فتوے دینے والے صحابیؓ اور صحابیہؓ کا بہت چھان بین کے بعد پتہ لگ سکا ہے۔ ان کی تعداد ایک سو تیس سے کچھ اوپر ہے۔''

ان مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے تین طبقات ہیں:

۱:...... پہلا طبقہ مکثرینِ صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ یہ وہ اربابِ فتویٰ صحابی ہیں جن کے فتووں کی سنن وآثار کی کتابوں میں اتنی کثرت اور بہتات ہے کہ انہیں یکجا کیا جائے تو ایک بڑی موٹی جلد تیار ہو جائے۔

۲:...... دوسرا طبقہ متوسطین صحابہ رضی اللہ عنہم کا ہے۔ یہ ان اربابِ فتویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے جن کے فتووں کی کتب وآثار وسنن میں اتنی کثرت نہیں کہ موٹی سی ایک کتاب بن جائے، لیکن اتنی تعداد ضرور منقول ہے کہ ان سے ایک رسالہ ترتیب پا جائے۔

۳:...... تیسرا طبقہ مقلین کا ہے۔ یہ ان اربابِ فتویٰ صحابہ رضی اللہ عنہم کا طبقہ ہے جن سے اتنے فتوے بھی حدیث کی کتابوں میں منقول نہیں کہ ایک چھوٹا موٹا رسالہ ہی بنایا جا سکے، بس ایک دو فتوے ہی منقول ہیں، وہ ایک جز (ایک یا دو ہی ورق) میں آ جائیں گے۔ چنانچہ علامہ ابن حزم اندلسی رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۴۵۶ھ لکھتے ہیں کہ:

مکثرین (کثرت سے فتوے دینے والے) سات اربابِ فتویٰ صحابیؓ یہ ہیں:

۱:...... ام المومنین حضرت عائشہؓ، ۲:...... حضرت عمر بن الخطابؓ، ۳:...... حضرت عبداللہ بن عمرؓ، ۴:...... حضرت علیؓ بن ابی طالب، ۵:...... حضرت عبداللہ بن عباسؓ، ۶:...... حضرت عبداللہ بن مسعودؓ، ۷:...... حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم ہیں۔

اور یہ سات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں، ان میں سے ہر ایک کے فتووں کو جمع کیا جائے تو وہ ایک موٹی کتاب بن جائے۔ ابوبکر محمد بن موسیٰ بن یعقوب بن امیر المومنین مامون نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے فتووں کو جمع کیا تو وہ بیس کتابوں میں یکجا ہوئے تھے۔ ابوبکر محمد رحمۃ اللہ علیہ جس کا ذکر اوپر آیا ہے، یہ علم فقہ و حدیث میں ائمہ اسلام میں سے ایک تھے۔

متوسطین میں وہ اربابِ فتویٰ صحابی ہیں جن سے زیادہ فتوے منقول نہیں، ان میں:

۱:...... ام المومنین حضرت ام سلمہؓ، ۲:...... حضرت انس بن مالکؓ، ۳:...... حضرت ابوسعید خدریؓ، ۴:...... حضرت ابوہریرہؓ، ۵:...... حضرت عثمان بن عفانؓ، ۶:...... حضرت عبداللہؓ بن عمرو بن العاص، ۷:...... حضرت عبداللہ بن زبیرؓ، ۸:...... ابوموسیٰ اشعریؓ، ۹:...... معاذ بن جبلؓ، ۱۰:...... حضرت ابوبکر صدیقؓ، ۱۱:...... حضرت سعد بن ابی وقاصؓ، ۱۲:...... حضرت سلمان فارسیؓ، ۱۳:...... جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم شامل ہیں، یہ تیرہ -۱۳- صحابیؓ ہیں۔

ان میں سے ہر ایک کے فتوے اگر جمع کیے جائیں تو ایک چھوٹا رسالہ بن جائے گا۔ انہی میں ۱:...... حضرت طلحہؓ، ۲:...... حضرت زبیرؓ، ۳:...... حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، ۴:...... حضرت عمران بن حصینؓ، ۵:...... حضرت ابوبکرؓ، ۶:...... حضرت عبادہ بن صامتؓ، ۷:...... حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہم کے ناموں کو اور بڑھایا جائے اور تیرہ -۱۳- میں سات -۷- کا اور اضافہ کیا جائے تو متوسطین کی تعداد بیس تک پہنچ جائے گی، اس صورت میں مکثرین اور متوسطین کی مجموعی تعداد ستائیس ہو جائے گی۔

باقی سب مقلین وہ صحابی ہیں جن میں ہر ایک سے ایک دوفتوے ہی منقول ہیں اور وہ بہت مختصر ہیں، ورق دوورق سے زیادہ نہیں ہیں، ان سے ہر ایک کے فتووں کا بہت مختصر جزء بنے گا۔ (۸) مکثرین، متوسطین صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجموعی تعداد کے پیش نظر علامہ ابن الہمام رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۸۶۱ھ نے شرح فتح القدیر میں لکھا ہے:

''لا تبلغ عدة المجتهدين الفقهاء منهم أكثر من عشرين''۔ (۹)

''صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں مجتہدین صحابہؓ کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں پہنچتی ہے۔''

ان ارباب فتویٰ صحابہؓ کی مجموعی تعداد ایک سوستر ہ سے کچھ اوپر ہے۔ ان میں ایک سو بیالیس -۱۴۲- صحابیؓ اور بیس -۲۰- صحابیہؓ ہیں، جن کی مجموعی تعداد ایک سو باسٹھ ہی ہوتی ہے۔ (۱۰)

لیکن ڈاکٹر احسان عباس، ڈاکٹر ناصر الاسد کی تحقیق اور شیخ احمد محمد شاکر کی مراجعت کے ساتھ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کا تیسرا رسالہ ''أصحاب الفتيا من الصحابةؓ و من بعد هم على مراتبهم في كثرة الفتيا'' میں ارباب فتویٰ صحابہؓ وصحابیاتؓ کی مجموعی تعداد ۱۴۹ مذکور ہے، ہم نے اس نقص کو علامہ ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ کی ''الأحکام صفحہ: ۹۳'' سے مقابلہ کیا تو مجموعی تعداد تو درست نکلی، لیکن صحابیاتؓ کی تعداد بیس نہیں بائیس ہے۔ اس لحاظ سے صحابہ رضی اللہ عنہم اور صحابیات رضی اللہ عنہن کی مجموعی تعداد ایک سو چونسٹھ -۱۶۴- ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مسلم معاشرے میں جب کبھی اور جہاں کہیں نت نئے مسائل پیش آئے، اکثر و بیشتر انہی سات اکابر مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم میں کسی نہ کسی کے پاس جا کر مسئلہ کا حکم، اس کا حل اور جواب پوچھا جاتا تھا اور جس سے معلوم کیا جاتا وہ اپنی مجتہدانہ بصیرت سے کبھی فوراً جواب دے کر سائل کو عمل کا راستہ بتاتا تھا، جیسا کہ کسی نے میراث کا ایک نہایت پیچیدہ مسئلہ دوران خطبہ ہی حضرت علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا، اور آپؓ نے اسی وقت اس کا حل بتایا، وہ جواب آج بھی مسئلہ منبریہ کے نام سے مشہور ہے۔ کبھی سائل سے کہا جاتا کہ بعد میں اس کا جواب دیا جائے گا، چنانچہ غور وفکر میں کبھی ایک مہینہ گزر جاتا تھا، چنانچہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے مہر اور میراث مفوضہ کے مسئلے کا جواب ایک مہینے کے بعد دیا تھا۔ (۱۱) اور جب انہیں معلوم ہوا کہ اس مسئلہ کا رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی جواب دیا تھا تو ایسی خوشی ہوئی تھی کہ زندگی میں عظیم کارنامے انجام دینے پر انہیں اتنی خوشی ومسرت نہیں ہوئی ہوگی، جتنی اس مسئلہ کے حل اور رسالت مآب ﷺ کے جواب کے ساتھ مطابقت وموافقت سے ہوئی تھی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مذکورہ بالا مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی فطرت میں کیسا عظیم اجتہادی ملکہ ودیعت کیا گیا تھا۔ اور بارگاہ رسالت ﷺ میں حاضری، صحبت وخدمت نے صحابہ رضی اللہ عنہم میں ایسا جلا و نور بخشا تھا کہ مشکل سے مشکل مسئلے کو حل کرنا اور اس پر عمل کرنا اُن کے لیے آسان تھا۔ ان اکابر مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کی مجتہدانہ صلاحیت اور فقیہانہ بصیرت، مزاج شریعت سے مناسبت اور اس میں رسوخ وپختگی نے انہیں مرجع خلائق بنایا تھا، مسائل کے حل میں سب کی نگاہیں انہی کی طرف اٹھتی تھیں اور انہی کے بتائے ہوئے مسئلوں پر عمل کیا جاتا تھا۔

مذکورہ بالا مجتہدین صحابہؓ میں سے ہر مجتہد نے جن مسائل کو حل کیا، یہ انفرادی اجتہادی مسائل کا ذخیرہ ہر مجتہد کے اندازِ فکر و نظر کا شاہد، اس کی اجتہادی آرا و نظریات کا جامع اور اس کی اصابتِ رائے کا شاہکار ہے۔

مذکورہ بالا مجتہدین صحابہؓ کے اجتہادی کام کی ابتدا عہدِ رسالت میں مدینہ منورہ سے ہوئی، جیسا کہ گزر چکا، پھر جیسے جیسے اسلامی قلمرو کی فتوحات کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا، ان کی اجتہادی سرگرمیوں کا دائرہ بھی اسلامی مملکت کے مرکزی شہروں میں وسعت اختیار کرتا گیا، ان کی تعلیمی و تربیتی مساعی سے ان کے طلبہ اور شاگردوں میں اجتہادی سلیقہ پروان چڑھتا گیا، چنانچہ ان کی وفات کے بعد ان کے شاگردوں نے اس بنیادی فریضے کو اسلامی قلمرو کے وسیع تر علاقے کے مرکزی شہروں میں انجام دینا شروع کیا۔

ان سات مجتہدین صحابہؓ کے جس مجتہدانہ کام کا آغاز عہدِ رسالت میں مدینہ سے ہوا تھا، وہ سارے اسلامی قلمرو میں پھیلا اور ان مکثرین صحابہؓ کے اجتہادی کام کا سلسلہ عہدِ صحابہؓ میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وفات پر ساتویں دہائی کے وسط میں اختتام پذیر ہوا اور ان کے نامور شاگردوں نے اس سلسلے میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، لیکن اس کا دائرہ انفرادی کوششوں تک محدود رہا، اور اسلامی قلمرو کی مقامی اور وقتی ضرورتوں کو پورا کرتا رہا، مگر شورائی نظامِ اجتہادی جس کا آغاز حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے دورِ خلافت میں کیا تھا، وہ اکابر مجتہدین کے اسلامی قلمرو میں مامور کیے جانے سے زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہ سکا۔

عہدِ رسالت میں بعض صحابہ رضی اللہ عنہم کی خدمتِ افتاء

فتوے دینا رسول اللہ ﷺ کا فرض منصبی تھا، قرآن میں اس کا ذکر ہے: ''یَسْتَفْتُوْنَکَ'' (۱۲) ''صحابہ رضی اللہ عنہم آپ (ﷺ) سے فتویٰ لیتے ہیں'' یعنی شرعی حکم معلوم کرتے ہیں۔ چنانچہ رسالت مآب ﷺ فتویٰ دیتے تھے، آپ ﷺ نے بعض مہاجر و انصار صحابہؓ کی بھی تربیت کی تھی اور وہ آپ ﷺ کی غیر موجودگی میں آپ ﷺ کی اجازت سے فتویٰ دیتے تھے۔ (۱۳) ان میں چھ صحابہ رضی اللہ عنہم کو شہرت حاصل تھی، تین مہاجر اور تین انصاری تھے، چنانچہ حضرت سہل بن ابی خیثمہ ساعدی رضی اللہ عنہ اپنے والد حضرت ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ سے نقل کرتے ہیں:

''کان الذین یُفتون علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم ثلاثة من المهاجرین و ثلاثة من الأنصار: عمر، و عثمان و علی و أُبی بن کعب و معاذ بن جبل، و زید بن ثابت رضی اللہ عنہم''۔ (۱۴)

''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فتویٰ دیتے تھے، ان میں تین حضرت عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم مہاجر تھے اور تین حضرت اُبی بن کعب، حضرت معاذ بن جبل اور زید بن ثابت رضی اللہ عنہم انصاری تھے۔''

علامہ جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ (متوفی ۹۱۱ھ) فرماتے ہیں: مجھے احادیث و آثار کے مطالعے سے معلوم ہوا کہ زمانۂ رسالت میں افتاء کی خدمت انجام دینے والے صحابہ رضی اللہ عنہم آٹھ تھے، میں نے انہیں دو

شعروں میں نظم کیا ہے، وہ شعر یہ ہیں:

وقد کان فی عصر النبیؐ ثمانیة
یقومون بالإفتاء قومة قانت
فأربعة أهل الخلافة معهم
معاذؓ، أبیؓ، و ابن عوفؓ، ابن ثابتؓ (۱۵)

یعنی ’’حضور اکرم ﷺ کے زمانے میں آٹھ صحابہ رضی اللہ عنہم فتاویٰ دینے کا ایسا اہتمام کرتے جیسے کوئی فرمانبردار اطاعت الٰہی کرتا ہے۔ ان میں چار خلفاء راشدین حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی رضی اللہ عنہم تھے اور ان کے ساتھ حضرت معاذ، حضرت ابی بن کعب، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم بھی یہ خدمت انجام دیتے تھے۔‘‘

مؤرخ علامہ عبدالرحمٰن ابن الجوزی رحمۃ اللہ علیہ متوفی ۵۹۷ھ نے ’’**کتاب المدهش**‘‘ میں عہدِ رسالت میں مفتیانِ صحابہؓ کی تعداد چودہ نقل کی ہے، موصوف کا بیان ہے:

’’من کان یفتی علی عهد رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: أبوبکر و عمر و عثمان و علی و عبدالرحمٰن بن عوف و ابن مسعود و أبی و معاذ و عمار و حذیفة و زید بن ثابت و أبو الدرداء و أبو موسٰی و سلمان رضی اللہ عنہم ‘‘۔ (۱۶)

عہدِ رسالت میں جو صحابہ رضی اللہ عنہم فتوے دیتے تھے، وہ ۱:......حضرت ابوبکر عبداللہ بن عثمان تیمی قرشیؓ (۵۱ق ھ-۱۳ھ/۵۷۳ء-۶۳۴ء)، ۲:......حضرت عمرؓ (۴۰ق ھ-۲۴ھ/۵۸۴ء-۶۴۴ء)، ۳:......حضرت عثمانؓ (۴۷ق ھ-۳۱ھ/ ۵۷۷ء-۶۵۶ء)، ۴:......حضرت علیؓ (۲۳ ق ھ- ۴۰ھ/ ۶۰۰-۶۶۱ء)، ۵:......حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ (۴۴ ق ھ-۳۲ھ/ ۵۸۰ء-۶۵۲ء)، ۶:......حضرت عبداللہ بن مسعود ہذلیؓ (۰۰۰-۳۲ھ/ ...... -۶۵۳ء)، ۷:......حضرت ابی بن کعب الانصاریؓ (۰۰۰-۲۱ھ/ ۰۰۰-۶۴۲ء)، ۸:......حضرت معاذ بن جبل خزرجی انصاریؓ (۲۰ ق ھ- ۱۸ھ/ ۶۰۳-۶۳۹ء)، ۹:......حضرت عمار بن یاسرؓ (۵۷ ق ھ- ۳۷ھ/ ۵۶۷-۶۵۷ء)، ۱۰:......حضرت حذیفہ بن الیمانؓ (۰۰۰-۳۶ھ/ ۰۰۰-۶۵۶ء)، ۱۱:......حضرت زید بن ثابت خزرجی انصاریؓ (۱۱ق ھ- ۴۵ھ/ ۶۱۱-۶۶۵ء)، ۱۲:......حضرت ابوالدرداء عویمر بن مالکؓ (۰۰۰-۳۲ھ/ ۰۰۰-۶۵۲ء)، ۱۳:......حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ (۲۱ ق ھ- ۴۴ھ/ ۶۰۲-۶۶۵ء)، ۱۴:......حضرت سلمان فارسیؓ (۰۰۰-۳۶ھ/ ۰۰۰-۶۵۶ء) رضی اللہ عنہم تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہدِ رسالت میں مجتہدین صحابہ رضی اللہ عنہم کے فتووں پر عمل کیا جاتا تھا اور ان کی فقہی بصیرت وتقلید کو راہِ نجات سمجھا جاتا تھا۔

www.banuri.edu.pk

خلافت راشدہ میں رائے اور فتووں پر عمل

خلافتِ راشدہ میں بھی رائے اور فتووں پر عمل کیا جاتا تھا، چنانچہ فقہاء سبعہ میں قاسم بن محمد بن ابی بکر رحمۃ اللہ علیہ المتوفی ۱۰۶ھ کا بیان ہے:

''ان أبابكر الصديقؓ كان إذا نزل به أمر يريد فيه مشاورةَ أهل الرأى وأهل الفقه، و دعا رجالًا من المهاجرين والأنصار، عمرؓ و عثمانؓ و عليًا و عبدالرحمٰن بن عوفؓ و معاذ بن جبلؓ و أبى بن كعبؓ و زيد بن ثابتؓ، و كل هولاء يفتى فى خلافة أبى بكرؓ، و إنما تصير فتوى الناس إلى هولاء، فمضٰى أبوبكرؓ على ذلك، ثم ولى عمرؓ فكان يدعو هؤلاء النفر، وكانت الفتوىٰ تصير و هو خليفة إلى عثمانؓ و أبيؓ و زيدؓ''۔

''بلا شبہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس جب کوئی نیا مسئلہ اور واقعہ پیش آتا، وہ اس میں اہل الرائے اور اہل فقہ سے مشورہ لینے کا ارادہ فرماتے تو مہاجرین وانصار میں سے حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو بلاتے تھے اور یہی لوگ خلافت صدیقی میں فتوے دیتے تھے اور لوگوں کی طرف سے جو سوالات آتے وہ انہی کو پہنچائے جاتے تھے۔ یہ فتاویٰ کے مرجع تھے اور انہی کا فتویٰ چلتا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں یہی معمول تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی حکمرانی کا زمانہ جب شروع ہوا تو وہ بھی انہی لوگوں کو بلاتے تھے اور انہی کے فتووں پر عمل جاری تھا۔ اور فتوے حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہم کو پہنچائے جاتے تھے۔'' (حضرت عثمان اور حضرت علی رضی اللہ عنہما کے دورِ فرمانروائی میں یہ خود فتوے دیتے تھے)۔

حواشی وحوالہ جات

۱:......کشف الاسرار علیٰ اُصول فخر الاسلام البزدویؒ، ج:۳،ص:۲۱۰، کراچی الصدف پبلشرز، الإجتهاد فى الشريعة الإسلامية و بحوث أخرى، إدارة الثقافة و النشر بالجامعة الإمام محمد بن سعود الإسلامية، ۱۴۰۴ھ۔

۲:......اُصول الجصاص، ج:۲،ص:۲۲۲۔

۳:......معالم السنن، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۱۶ھ، ج:۴،ص:۱۵۳، بذل المجہود، کراچی، معہد الخلیل، ج:۴،ص:۳۰۹۔

۴:......تفسیر القرآن العظیم، مصر، مصطفیٰ البابی، ۱۳۵۶ھ، ج:۱،ص:۳۔

۵:......طبقات الفقہاء للشیرازی، بغداد ۱۳۵۶ھ، ص:۳۔

۶:......مقدمہ ابن الصلاح ومحاسن الاصطلاح، القاہرۃ، دار المعاد، طبع ۱۴۱۱ھ، ص:۴۹۴۔

☆......تدریب الراوی، طبع ۱۹۵۹ء، ص:۴۰۵، ۴۰۶۔

☆......إرشاد طلاب الحقائق إلی معرفة سنن خیر الخلائق للنوویؒ، المدینه المنورة، مکتبة الإیمان ۱۴۰۸ھ، ج:۲،ص:۵۹۷۔

۷:......الأحکام، القاہرة، إدارة الطباعة المنیریة، ۱۳۴۷ھ، ج:۵،ص:۹۲۔

۸:......الأحکام،، ج:۵،ص:۹۲-۹۳،(ولـه) الرسالة الثالثة، أصحاب الفتیا من الصحابةؓ ومن بعدهم علی مراتبهم فی کثرة الفتیا، ص: ۳۱۹۔اس رسالے میں ابن حزم رحمۃ اللہ علیہ نے ارباب فتویٰ کی مجموعی تعداد ایک سو باسٹھ بیان کی ہے، ان میں ۱۴۲ مرد اور ۲۰ خواتین ہیں۔مکثرین سات، اور متوسطین ۱۳ بیان کیے ہیں، باقی سب مقلین ہیں۔ یہ رسالہ سید کروی حسن کی تحقیق سے دار الکتب العلمیہ نے ۱۳۵۱ھ میں بیروت سے شائع کیا ہے۔

۹:......شرح فتح القدیر، ج:۳،ص:۳۳۰۔ ۱۰:......ایضاً، اصحاب الفتیا۔

۱۱:......سنن ابی داوٗد، ج:۱،ص:۲۸۸، کراچی، سعید اینڈ کمپنی۔

۱۲:......النساء: ۱۲۷، ۱۷۶۔ ۱۳:......السیوطیؒ، الحاوی للفتاوی، بیروت، دار الکتب العلمیہ، ۱۴۰۲ھ، ۱۹۸۲ء، ج:۱،ص:۱۶۱۔

۱۴:......الطبقات الکبریٰ، بیروت، دار صادر، ج:۲،ص:۳۵۱۔

۱۵:......الحاوی للفتاوی، ج:۱،ص:۱۶۲، (له) الکنز المدفون فی الفلک المشحون، ص:۲۵۲۔

۱۶:......المدہشی، بیروت، عباس احمد الباز، ص:۵۱۔

(جاری ہے)

www.banuri.edu.pk

کعب احبار رحمۃ اللہ علیہ اور اسرائیلیات

مولانا محمد بلال بربری

اہل علم خصوصاً تفاسیر قرآن سے شغف رکھنے والوں کے لیے کعب احبارؒ کوئی غیر معروف نام نہیں، اسرائیلیات کی روایت کے باب میں کعب احبارؒ کا تذکرہ تقریباً تمام تفاسیر میں کہیں نہ کہیں ضرور موجود ہوتا ہے۔ کعب احبارؒ کے متعلق صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مختلف رویوں کی بنا پر کعب احبارؒ کی شخصیت اور ان کی ثقاہت اہل علم کے ہاں زیر بحث رہتی ہے۔ علامہ کوثری رحمۃ اللہ علیہ نے کعب احبارؒ کے متعلق اسی قسم کے ایک سوال کے جواب میں ایک مضمون تحریر کیا تھا، جو اپنی جامعیت کے ساتھ ساتھ اپنی افادیت میں بھی بھرپور ہے۔ اس مضمون میں ''اسرائیلیات'' کے باب میں ایک فیصلہ کن موقف بیان کیا گیا ہے۔ اس عربی مضمون کا ترجمہ اردو دان طبقے کے فائدے کے لیے پیش خدمت ہے۔ (از مترجم)

قریبی علاقوں کے کچھ فضلاء اہل علم کی خواہش تھی کہ میں مندرجہ ذیل سوال کے جواب کے بارے میں اپنی رائے پیش کروں، چنانچہ اس موضوع کے متعلق میں نے اپنی بساط کے مطابق کچھ تحریر کیا۔ ذیل میں سوال کی عبارت اور پھر اس کے متعلق میرا جواب حاضر خدمت ہے:

سوال:

جنت وجہنم کے متعلق اہل اسلام کے افکار ونظریات پر کعب احبار (یہودی یا مسلمان) کی ذکر کردہ روایات کا کس قدر اثر ہے؟ مثلاً قصۂ اسراء ومعراج کے بارے میں مولائے مسلمانان ابن عباسؓ سے کعب احبار کی ذکر کردہ روایت جس کا ہماری قوم میں خوب شہرہ ہے، اور ''**التفسیر الحدیث**'' (جلد ثانی) میں بھی موجود ہے؟

جواب:

اب میرا جواب ملاحظہ کیجیے: سائل نے ''**التفسیر الحدیث**'' سے اپنی مراد واضح نہیں کی، اور نہ ہی اس قصے ہی کو بتایا ہے جو قوم میں مشہور ہے کہ اس کے متعلق کسی طور پر کھل کر بات کی جا سکے، اگر سائل کی مراد اس قصے سے وہ طویل قصہ ہے جس کو ابن جریرؒ وغیرہ مفسرین نے سورۂ اسراء کی تفسیر میں ذکر کیا ہے،

تو اس کی سند میں نہ تو کعبؒ ہیں اور نہ ہی ابن عباس رضی اللہ عنہما، بلکہ اس روایت میں ابوجعفر عیسی بن ماہان رازی ہیں جو اپنے ضعف حافظہ کی وجہ سے معروف ہیں۔ اسی طرح اس روایت میں ابو ہارون عمارہ بن جوین اور خالد بن یزید بن ابو مالک ہیں، اور یہ دونوں متہم بالکذب ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان رواۃ کی روایت حجت نہیں ہوسکتی، خاص طور پر اس طویل قصے جیسی روایات میں۔ اس طویل قصے کا کعبؒ سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں، مزید یہ کہ جنت وجہنم دونوں ایسے موضوعات ہیں جن کے ذکر سے موجودہ تورات کے نسخے جو آج یہود کے پاس ہیں، خالی ہیں، حتیٰ کہ ان دونوں کے ذکر سے تورات کا خالی ہونا تورات کے محرف ہونے پر واضح دلائل میں سے شمار کیا جاتا ہے، اس لیے کہ یہ تورات جنت وجہنم کے اس اہم موضوع سے خالی ہے، جو انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کے خاص پہلو ''ایمان بالبعث بعد الموت'' (موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنے کے عقیدے پر ایمان) سے متعلق ہے۔ لہٰذا یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ کعبؒ جنت وجہنم کے متعلق قصے کتب یہود سے نقل کرتے ہوں، بلکہ ''تلمود'' میں تو تناسخ (آواگون) کے متعلق بھی نص موجود ہے، جو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کی دعوت کے سراسر منافی عقیدہ ہے۔

رؤیتِ باری تعالیٰ اور کعبؒ وابن عباس رضی اللہ عنہما کا مکالمہ

البتہ معراج کی رات رؤیتِ باری تعالیٰ کے بارے میں جو گفتگو کعبؒ اور ابن عباس رضی اللہ عنہما کے درمیان ہوئی ہے، وہ امام ترمذی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی جامع میں ''سورۃ النجم'' کی تفسیر کے ذیل میں روایت کی ہے، لیکن اس کی سند میں مجالد بن سعید موجود ہیں جو حافظے کے کمزور اور مختلط ہیں۔ اس روایت میں جو شعبیؒ کے الفاظ ہیں، وہ اس روایت کے اتصال کا فائدہ نہیں دیتے ہیں اور کچھ احادیث صحاح بھی اس روایت کے معارض مروی ہیں۔

کعبؒ کا تعارف

یہ کعبؒ جو موضوع بحث ہیں، انہیں ''کعب احبار'' اور ''کعب حبر'' کہا جاتا ہے۔ یہ ''ابن مانع حمیری'' ہیں۔ یہود کے سرکردہ اہل علم میں سے تھے اور کتب یہود کے بارے میں سب سے وسیع اطلاع رکھتے تھے۔ مخضرمین میں سے تھے جنہوں نے زمانۂ جاہلیت اور زمانۂ اسلام دونوں پائے۔ یمن میں پیدا ہوئے، اور وہیں رہائش پذیر رہے، تا آنکہ وہاں سے ہجرت فرمائی، اور سن ۱۲ ہجری حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دور میں اسلام لائے۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے اہل شام کے تابعین میں آپ کو طبقۂ اولیٰ میں ذکر کیا ہے، اور مزید کہتے ہیں کہ: ''آپ دین یہود پر تھے، پھر اسلام لائے اور مدینہ منورہ ہجرت فرمائی، شام کی طرف روانہ ہوگئے اور تاحیات حمص ہی میں رہے۔ سن ۳۲ ہجری حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں آپؒ کی وفات ہوئی۔ سن وفات کے بارے میں ایک سے زائد قول ہیں۔

ابن حبان رحمۃ اللہ علیہ ''الثقات'' میں فرماتے ہیں: آپؒ نے سن ۳۴ ہجری میں وفات پائی، اور

ایک قول کے مطابق سن ۳۴ ہجری میں وفات پائی۔ ۱۰۴ سال زندگی پائی۔ ابن سعد رحمۃ اللہ علیہ نے ابن مسیّب رحمۃ اللہ علیہ کی روایت نقل کی ہے کہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے کعبؓ سے فرمایا: آپ کو عہد نبوی، اور عہد صدیقی میں اسلام لانے سے کیا چیز مانع تھی کہ آپ عہد فاروقی میں اسلام لائے؟ تو کعبؓ نے جواب میں کہا: میرے والد نے میرے لیے تورات کے منتخبات سے ایک کتاب تیار کی تھی اور کہا تھا کہ: ''بس! اس پر عمل کرو''، اور باقی تمام کتب کو مہر بند کر دیا تھا، اور مجھ سے باپ بیٹے کا عہد لیا تھا کہ میں ان کتب سے مہر کو نہ توڑوں، جب میں نے اسلام کے غلبے کو دیکھا تو میں نے سوچا کہ شاید میرے والد نے مجھ سے ان کتب میں کوئی علم چھپا کر رکھا ہے، چنانچہ میں نے اس مہر کو کھولا تو اس میں آپ ﷺ اور آپ ﷺ کی امت کا تذکرہ موجود تھا، چنانچہ میں مسلمان ہو کر آ گیا۔

اس قصے کی سند میں حماد بن سلمہ ہیں جو مختلط تھے، اور جن کی روایت سے امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ و امام مسلم رحمۃ اللہ علیہ دونوں پرہیز کرتے ہیں۔ البتہ حماد بن سلمہ کی دوسری روایات جو ثابتؒ سے ہیں، وہ چونکہ مرضِ اختلاط کے بعد بھی ویسی ہی تھیں، جیسی مرض اختلاط سے پہلے تھیں، اس لیے وہ روایات بخاریؒ و مسلمؒ نے ذکر کی ہیں۔ نیز اس روایت میں علی بن زید بن جدعان بھی ہیں، جنہیں کئی اہل علم نے ضعیف قرار دیا ہے۔

کعبؒ کی ثقاہت و عدمِ ثقاہت

جمہور اہل علم نے کعبؒ کی توثیق کی ہے، یہی وجہ ہے کہ ضعفاء و متروکین کی کتب میں آپ کو ان کا تذکرہ نہیں ملے گا۔ امام ذہبی رحمۃ اللہ علیہ نے انہیں طبقات الحفاظ میں ذکر کیا ہے، اور ان کا مختصر سا تعارف ذکر کیا ہے۔ ابن عساکر رحمۃ اللہ علیہ نے تاریخ دمشق میں آپ کا کھل کر تعارف پیش کیا ہے۔ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ''**حلیۃ الأولیاء**'' میں کعبؒ کے قصص، آپ کے مواعظ، آپ کی مجالس، آپ کی حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو نصائح، اور جنت و جہنم کے متعلق آپ کی روایات کو طویل سند کے ساتھ مفصل ذکر کیا ہے، جس سند میں فرات بن سائب بھی ہیں، البتہ ابونعیم رحمۃ اللہ علیہ نے ان کا ماخذ ذکر نہیں کیا۔ ابن حجر رحمۃ اللہ علیہ نے ''**الإصابۃ**'' اور ''**تہذیب التہذیب**'' میں آپ کا تعارف پیش کیا ہے۔ بہرحال نقاد محدثین آپ کی ثقاہت پر متفق ہیں، لیکن امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی صحیح کی ''**کتاب الاعتصام**'' میں حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کا مقولہ نقل کیا ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے کعبؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا: ''ہم اس کے جھوٹ کا امتحان لیتے ہیں''۔ ''**الإصابۃ**'' میں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے کعبؒ کی تکذیب مروی ہے۔ اسی طرح ابن عباس رضی اللہ عنہما نے بھی کعبؒ کو جھوٹ کی طرف منسوب کیا ہے۔

ملا علی قاری رحمۃ اللہ علیہ موضوعات کبریٰ (صفحہ: ۱۰۰، طبع ہند) میں فرماتے ہیں: حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جب مسجد اقصیٰ کی تعمیر کا ارادہ فرمایا تو لوگوں سے مشورہ کیا کہ مسجد کی تعمیر ''صخرہ'' کے

آگے کی جائے یا پیچھے؟ کعبؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا: امیر المؤمنین! صخرہ کی پچھلی جانب تعمیر کیجیے۔ تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: اے یہودی عورت کے بیٹے! تجھ میں یہودیت سرایت کی ہوئی ہے، میں اس مسجد کو صخرہ کی اگلی جانب تعمیر کروں گا، تاکہ نمازی اس صخرہ کا استقبال نہ کریں، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اس کو اسی طرح تعمیر کیا جس طرح اب تک موجود ہے۔

یہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی فکر ونظر تھی کہ وہ کعبؒ کو کسی طور یہ موقع نہ دینا چاہتے تھے کہ وہ مسلمانوں کی مسجد میں یہود کے قبلے کی طرف رخ کر سکے۔ کعبؒ نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی جانب سے اپنے اوپر لگنے والی تہمت کو دل میں رکھا تھا، حتیٰ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے خلاف سازشیوں کے ساتھ بھی کعبؒ کے تعلقات دیکھے گئے تھے۔ اس کے ساتھ ساتھ کعبؒ، اہل کتاب کی کتب سے نقل کردہ روایت باور کرواکر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے یہ بھی کہا کرتے تھے کہ وہ عنقریب قتل کیے جائیں گے، حالانکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ اور اہل کتاب کی سابقہ کتب کا کیا تعلق!!! اگر شریعت اسلامیہ میں متہم بالظن کو پکڑنے کی گنجائش ہوتی تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے قتل کے معاملے میں شرعی عدالت حضرت کعبؒ سے بھی تفتیش کرتی۔ حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کو حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی شکایت کی بنا پر دمشق سے مدینہ منورہ بھیج دیا جانا، کعبؒ کا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی مجلس میں حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کی مال جمع کرنے اور ذخیرہ کرنے کے بارے میں رائے کی تردید اور حضرت ابو ذر رضی اللہ عنہ کا کعبؒ سے یوں خطاب فرمانا: اے یہودی عورت کے بیٹے! یہ تیرے مسائل میں سے نہیں ہے (کہ تو اس پر گفتگو کرے)، یہ واقعات کتب تاریخ میں معروف ہیں۔ اسی طرح یہ بھی ثابت ہے کہ عوف بن مالک رضی اللہ عنہ نے کعبؒ کو قصہ گوئی سے منع کیا تھا، یہاں تک کہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے انہیں اس کی اجازت مرحمت فرمائی۔

مذکورہ بحث کا نتیجہ

ماقبل کی تفصیل سے واضح ہوا کہ حضرت عمرؓ، حضرت حذیفہؓ، حضرت ابو ذرؓ، حضرت ابن عباسؓ، حضرت عوف بن مالکؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہم کعبؒ پر کلی اطمینان نہیں رکھتے تھے، جب کہ حضرت ابن عمرؓ، حضرت ابن عباسؓ اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہم نے کعبؒ سے کچھ روایات بھی نقل کی ہیں، اس لیے کہ تمام اسرائیلیات ایک فیصلہ کن قاعدے کے تحت آتی ہیں کہ ان میں سے جس روایت کی شریعت اسلامیہ تصدیق کرے، اس کی تصدیق کی جائے اور شریعت اسلامیہ جس روایت کی تکذیب کرے، اس کی تکذیب کی جائے، اور اس کے علاوہ دیگر روایات کی تصدیق وتکذیب کے بارے میں توقف کیا جائے۔ صحیح بخاریؒ کی ایک روایت ہے: ''اہل کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ ہی تکذیب، اور یوں کہو کہ ہم اللہ پر ایمان لائے، اور اس پر جو ہماری طرف نازل ہوا، اور جو تمہاری طرف نازل ہوا، ہمارا اور تمہارا الٰہ ومعبود ایک ہی ہے، اور ہم اسی کے تابعدار ہیں''۔

یہی وہ درست راہ ہے، جس پر اسرائیلیات کے کسی خطرے کا خوف نہیں ہے، اس لیے کہ

جنہوں نے اسرائیلیات ذکر کیں، انہوں نے اسی نظریے کے ساتھ ذکر کیں کہ یہ اسرائیلیات اس خالص اور سچی کسوٹی پر پرکھی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ نہ کعبؓ اور نہ ہی اسرائیلیات کا کوئی اور راوی ہی اسلامی افکار، نظریات اور تعلیمات پر کسی بھی طرح اثر انداز ہوسکتا ہے، جب تک کہ ان کی روایات اس دقیق معیار پر جانچی جاتی رہیں گی۔ اسی بنا پر آپ نے بہت کئی مفسرین کو دیکھا ہوگا کہ وہ ہر نفع بخش روایت کو نقل ضرور کرتے ہیں، تاکہ ان مفسرین کے زمانے میں مروج یہود وغیرہ اہل کتاب سے منقول معارف و روایات کی روشنی میں قرآن کریم کی ذکر کردہ اخبار و قصص کے بعض پہلو واضح ہو جائیں، ساتھ ہی یہ مفسرین ان روایات کی چھان بین بعد میں آنے والے نقاد کے حوالے کرتے ہیں۔ اس طرح اسرائیلیات کے ذکر کرنے کا مقصد ان کے پیش نظر یہ ہوتا ہے کہ کم از کم یہ معارف بعد میں آنے والوں تک پہنچ ضرور جائیں، اس لیے کہ یہ احتمال تو بجا طور پر موجود ہوتا ہے کہ ان اسرائیلیات سے قرآن کریم کے اجمالی بیانات کی وضاحت میں مدد لی جاسکے۔ مفسرین کی یہ غرض نہیں ہوا کرتی کہ ان روایات کو مسلمانوں کی نظر میں حقائق وعقائد کا درجہ دے دیا جائے، جن کے صحیح ہونے کا عقیدہ رکھا جانا ضروری ہو، اور کسی چھان بین کے بغیر ان روایات کو ان کی کمزوریوں کے باوجود قبول کرلیا جائے۔ چنانچہ اسرائیلیات کی تدوین کرنے والوں پر- جب تک کہ ان کا مقصد یہی ہو- کسی قسم کی ملامت وتنقید نہیں کی جاسکتی۔

سلیمان بن عبدالقوی طوفی رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی کتاب ''**الاکسیر فی قواعد التفسیر**'' میں مفسرین کے اپنی تفاسیر کو اسرائیلیات سے بھر دینے کے بارے میں اعتذار پیش کرتے ہوئے ان کا مقصد یہی بیان کیا ہے۔ ''**الاکسیر فی قواعد التفسیر**'' مکتبہ قراحسام الدین جو آستانہ میں واقع ہے، محفوظ ہے۔ انہوں نے مفسرین کے اس طریق کار کی مثال رواتِ حدیث کے طریق کار سے دی ہے کہ جس طرح انہوں نے شروع شروع میں تمام روایات کے بلا کم وکاست نقل کردینے کا اہتمام کیا اور ان روایات کے صحیح وضعیف ہونے کا معاملہ آنے والے ناقدین پر چھوڑ دیا، یہی طرزِ عمل ان مفسرین نے بھی اختیار کیا ہے۔ یہ عذر واقعی عمدہ ہے۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ باطل اسرائیلیات سے صرف وہی شخص دھوکہ کھا سکتا ہے جو کثیر پہلو مباحث میں بھی اہل علم کی طرف رجوع کیے بغیر ہر ایک سے روایات لے لینے کا عادی ہو۔ مزید یہ کہ اہل علم کی ایک کثیر تعداد نے ان کھوٹی روایات کی، جو امت کو کسی طرح نقصان پہنچا تیں، جانچ کا خصوصی اہتمام فرمایا ہے، چنانچہ انہوں نے تفسیر کو باطل اسرائیلیات سے خالی کرنے کی خدمت بھی انجام دی ہے، جیسا کہ شیخ عبدالحق بن عطیہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنی تفسیر ''**المحرر الوجیز فی تفسیر کتاب اللّٰہ العزیز**'' میں کیا۔ نتیجہ یہ کہ اسرائیلیات اور اسی قسم کی ساری خرافات اسلامی تعلیمات پر کسی طرح اثر انداز نہیں ہوسکتی ہیں۔ البتہ ان سے بعض عوام اور وہ حضرات جو اپنے آپ کو اہل علم سمجھتے ہیں اور اہم مسائل و معاملات میں بھی علماء اور مستند مآخذ کی طرف رجوع کرنے سے اپنے آپ کو مستغنی خیال کرتے ہیں، ضرور متأثر ہوسکتے ہیں۔ اللہ ہی سیدھی راہ دکھلانے والے ہیں۔

توبہ کا مفہوم، اقسام واہمیت اور طریقہ کار

مفتی عارف محمود

ابنِ قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''توبہ انسان کی پہلی، درمیانی اور آخری منزل ہے، بندہ سالک اُسے کبھی اپنے سے جدا نہیں کرتا، مدت تک توبہ اور رجوع کی حالت میں رہتا ہے۔ اگر ایک مقام سے دوسرے مقام کی طرف سفر اختیار کرتا ہے تو توبہ اس کا رفیق ہوتا ہے جہاں وہ جائے، پس توبہ بندہ کی ابتدا بھی ہے اور انتہا بھی، بلکہ ابتدا کی طرح موت کے وقت اس کی ضرورت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔'' (مدارج السالکین، صفحہ: ۱۴۱)

توبہ دل کا نور ہے، نفس کی پاکیزگی ہے، توبہ انسان کو اس حقیقی زندگی کی طرف رہنمائی کرتی ہے کہ: اے غافل انسان! آؤ! قبل اس کے کہ زندگی کا قافلہ کوچ کر جائے اور موت اپنی تمام تر حشر سامانیوں کے ساتھ آموجود ہو، توبہ کرنے والوں کی ہم نشینی اختیار کرلیں، کیونکہ یہ ایک اٹل حقیقت ہے کہ قبر محض ایک گڑھا نہیں، بلکہ جنت کے باغوں میں سے ایک باغ ہے یا جہنم کے گڑھوں میں سے ایک گڑھا ہے۔ (كما رواه الترمذي في سننه عن أبي هريرةؓ، كتاب صفة القيامة: ۴/۶۳۹-۶۴۰، رقم الحديث: ۲۴۶۰)

پس جس کی ابتدا توبہ اور رجوع سے روشن اور چمکدار ہوگی، اس کی انتہا بھی نورِ مغفرت سے منور ہوگی، جو اللہ کی طرف رجوع اور توبہ میں اخلاص اور سچائی کو اختیار کرے گا، اللہ تعالیٰ اُسے خاتمہ بالخیر کی توفیق عطا فرمائیں گے۔

توبہ سب کے لیے

توبہ صرف گنہگاروں کے ساتھ خاص نہیں، بلکہ سب ایمان والوں کو توبہ کا حکم دیا گیا ہے، اللہ رب العزت کا ارشادِ گرامی ہے:

''وَتُوْبُوْا إِلَى اللّٰهِ جَمِيْعًا أَيُّهَا الْمُؤْمِنُوْنَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ''۔ (النور:۳۱)

ترجمہ: ''اور توبہ کرو اللہ کے آگے سب مل کر اے ایمان والو! تاکہ تم بھلائی پاؤ''۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

صحیح مسلم میں حضرت مزنی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: اے لوگو! گناہوں سے باز آجاؤ اور اللہ کی طرف رجوع کرلو اور میں ایک دن میں سو مرتبہ اللہ کی طرف رجوع کرتا

ہوں۔ (صحیح مسلم، باب استحباب الاستغفار والاستکثار منه، رقم: ۷۰۳۴)

غور فرمائیں کہ جب اللہ تعالیٰ کے آخری نبی ﷺ جو اولین وآخرین کے سردار ہیں، بخشے بخشائے ہوئے ہیں، تمام جنتیوں کے سردار ہیں، مقامِ محمود کے مالک ہیں، وہ ایک دن میں سو مرتبہ اللہ تعالیٰ کی طرف توبہ واستغفار کے عمل کو اختیار کرتے ہیں تو ہم گنہگار اور خطا کار امتیوں کو کس قدر توبہ واستغفار کا اور اللہ کی طرف رجوع کا اہتمام کرنا چاہیے!۔

گناہوں سے فوری توبہ کی ضرورت

آج کے اس پرآشوب ماحول میں تمام اہل ایمان کو چاہیے کہ بغیر کسی استثنا کے فوری توبہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کریں۔ موت سے پہلے موقع ہے، اسے ضائع نہ کریں، اللہ رحیم وکریم بھی اپنے بندوں کی توبہ کا انتظار فرماتے ہیں اور ان کی توبہ کو قبول کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ بندہ توبہ کرے اور وہ قبول فرمائے، چنانچہ قرآن کریم میں ارشادِ خداوندی ہے:

''وَاللّٰهُ يُرِيْدُ أَنْ يَّتُوْبَ عَلَيْكُمْ''۔ (النساء:۲۷)

ترجمہ: ''اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر متوجہ ہوئے''۔ (ترجمہ از: شیخ الہندؒ)

گناہ کر کے توبہ نہ کرنے کا انجام

یہ یاد رکھیں کہ گناہ کا صدور ہونا ایمان کے منافی نہیں۔ ایمان والے سوائے انبیا علیہم السلام کے کوئی بھی معصوم نہیں اور عام انسانوں سے گناہ کا ہو جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں۔ گناہ کا ہو جانا اور بھول چوک تو انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ یہ اتنا خطرناک اور ہلاکت خیز نہیں، جتنا گناہ ہو جانے کے بعد توبہ نہ کرنا اور اس سے غفلت اختیار کرنا ہلاکت آمیز اور تباہ کن ہے۔ مسلم شریف میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''والذی نفسی بیده لو لم تذنبوا لذهب اللّٰه بكم ولجاء بقوم يذنبون فيستغفرون اللّٰه فيغفر لهم''۔ (صحیح مسلم، باب سقوط الذنوب بالاستغفار، رقم: ۷۱۴۱)

ترجمہ: ''قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضۂ قدرت میں میری جان ہے، اگر تم گناہوں کا ارتکاب نہ کرو تو اللہ تعالیٰ تمہیں ختم کر کے ایسی قوم کو لے آئیں گے جو گناہ کرے گی اور اللہ سے اپنے گناہوں کی مغفرت طلب کرے گی تو اللہ ان کی مغفرت فرما دیں گے۔

سننِ ترمذی اور سننِ ابنِ ماجہ میں حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

''كل بني آدم خطاء وخير الخطائين التوابون''۔ (سنن الترمذي، كتاب صفة القيامة، رقم: ۲۴۹۹)

ترجمہ: ''تمام بنی آدم خطا کار ہیں اور بہترین خطا کار توبہ کرنے والے ہیں''۔

ان روایات سے معلوم ہوا کہ بندہ کا توبہ کرنا اور اللہ کی طرف رجوع کرنا انتہائی ضروری ہے،

www.banuri.edu.pk

ورنہ اسے اپنے نفس پر ظلم کرنے والوں میں سے شمار کیا جائے گا، امام مجاہد رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''من لم يتب إذا أصبح وإذا أمسٰى فهو من الظالمين''۔

ترجمہ: ''جو شخص (ہر روز) صبح وشام توبہ نہیں کرتا وہ ظالمین میں سے ہے''۔ (تفسیر الثعلبي: ۱/۱۱۹)

طلق بن حبیب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حقوق کی ادائیگی بہت بڑی بات ہے، مگر تم توبہ کی حالت میں صبح وشام کرو''۔ (تفسیر ابن کثیرؒ: ۸/۷۸، التفسیر المنیر: ۱۳/۲۵۶)

ابن رجب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں: ''جس نے بغیر توبہ کیے صبح وشام کی وہ خطرے میں ہے، اُسے یہ خوف دامن گیر ہوتا ہے کہ کہیں بغیر توبہ کے اللہ سے ملاقات نہ ہوجائے اور اللہ اس کا شمار ظالموں میں نہ کردیں''۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ''۔ (الحجرات: ۱۱)....''اور جو کوئی توبہ نہ کرے تو وہی ہیں بے انصاف''۔ (لطائف المعارف، ص: ۴۵۸)

ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آیت ''مَنْ لَّمْ يَتُبْ فَأُولٰئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ'' میں بندوں کی دو قسمیں بیان فرمائی ہیں: ۱:......توبہ کرنے والے۔ ۲:......ظالم، اور یقیناً ان دو کے علاوہ کوئی تیسری قسم نہیں، اور توبہ نہ کرنے والوں کو اللہ نے ظالم شمار کیا ہے۔ (مدارج السالکین، صفحہ: ۱۴۲)

معصیت کے نقصانات

حضرت ابن قیم رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ بندے کو چاہیے کہ اسے معلوم ہو کہ گناہ ومعاصی نقصان دہ اور ہلاکت میں ڈالنے والے ہیں، جس طرح مختلف قسم کے زہر سے بدن انسانی متأثر ہوتا ہے اور ہلاکت کا باعث بنتا ہے، ایسے ہی گناہ سے انسانی دل متأثر ہوتا ہے۔ دنیا وآخرت میں جتنے شرور و بیماریاں ہیں، ان سب کا سبب صرف گناہ اور معاصی ہیں۔ (الداء والدواء، ص: ۶۰)

کسی اللہ والے کا قول ہے:

''لاتنظر إلٰى صغر الخطيئة ولكن انظر إلٰى مَنْ عصيتَ''۔

ترجمہ: ''تم گناہ کے چھوٹے ہونے کو مت دیکھو، بلکہ تم جس کی معصیت کر رہے ہو اس کی عظمت کو پیش نظر رکھو''۔ (أخرجه أحمد في الزهد، ص: ۴۶۰، تهذيب الداء و الدواء: ۱/۵۴)

حضرت بشر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''لو تفكر النّاس في عظمة اللّٰه ما عصوا اللّٰهَ عزّ و جلّ''۔ (تفسیر ابن کثیرؒ: ۲/۱۸۵)

ترجمہ: ''اگر اللہ کی عظمت لوگوں کے پیشِ نظر رہے تو وہ اللہ کی نافرمانی سے باز آجائیں گے''۔

توبہ کی تعریف

گناہوں اور معصیت سے جس توبہ کا ہم سے بار بار مطالبہ کیا گیا ہے، اس کی حقیقت سے واقف ہونا انتہائی ضروری ہے۔ اگر توبہ کی حقیقت نہ پائی جارہی ہو تو صرف زبان سے توبہ توبہ کہنا کافی نہیں۔

لغت میں توبہ لوٹنے اور رجوع کرنے کو کہتے ہیں، علامہ رازی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’مختار الصحاح، صفحہ: ۵۹‘‘ میں اور علامہ فیروز آبادی رحمۃ اللہ علیہ نے ’’القاموس المحیط، صفحہ: ۵۹‘‘ میں لکھا ہے: ’’تاب إلی اللّٰہ‘‘ اور ’’توبۃ‘‘ گناہ اور معصیت سے لوٹنے کو کہا جاتا ہے۔ شریعت میں اللہ کی معصیت و نافرمانی کو ترک کرکے اس کی اطاعت اختیار کرنے کو توبہ کہتے ہیں۔

توبہ کی حقیقت اور مراتب

سچی توبہ کے لیے علما نے کچھ شرائط ذکر کی ہیں، چنانچہ امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

’’ہی الندم بالقلب، وترک المعصیۃ فی الحال، و العزم علٰی ألا یعود إلٰی مثلہا، وأن یکون ذلک حیاءً من اللّٰہ‘‘۔ (تفسیر القرطبی، سورۃ النساء: ۹۱/۵)

ترجمہ: ’’(یقیناً سچی توبہ) وہ یہ ہے کہ (اس میں یہ درج ذیل چیزیں پائی جائیں): ۱:...... گناہ پر دل سے ندامت ہو، ۲:...... فوری طور پر گناہ کو ترک کرے، ۳:...... اور پکا ارادہ کرے کہ دوبارہ اس معصیت کا ارتکاب نہیں کرے گا، ۴:...... اور یہ سب کچھ ’’اللہ کی حیا‘‘ کی وجہ سے ہو‘‘۔

مراتبِ توبہ

توبہ کے تین مراتب ہیں: ۱:...... توبہ کا سب سے بڑا اور لازمی درجہ ترکِ کفر اور قبول ایمان ہے۔ ۲:...... اس کے بعد دوسرا بڑا درجہ کبائر (بڑے گناہوں) سے توبہ کا ہے۔ ۳:...... تیسرا مرتبہ صغیرہ گناہوں سے توبہ کا ہے۔

توبہ کی اقسام

توبہ کی دو قسمیں ہیں: ۱:...... واجب، ۲:...... مستحب۔ کسی بھی مامور کے ترک اور محظور وممنوع کام کے کرنے سے توبہ کرنا فی الفور واجب اور ضروری ہے اور یہ تمام مکلّف اہلِ ایمان پر واجب ہے۔ مستحبات کے ترک اور مکروہات کے ارتکاب سے توبہ کرنا مستحب ہے۔ (جامع الرسائل لابن تیمیۃؒ، رسالۃ فی التوبۃ: ۲۲۷/۱)

سچی اور صحیح توبہ کی شرائط

۱:...... فوری طور سے معصیت و گناہ سے باز آنا۔

۲:...... تمام سابقہ گناہوں پر دل سے ندامت ہو، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: **’’الندم التوبۃ‘‘**، یعنی ندامت توبہ ہے۔ (مسند أبی یعلی، مسند عبد اللہ بن مسعودؓ، رقم: ۴۹۶۹، ۵۰۸۱، ۵۱۲۹) ندامت ہی توبہ کا رکنِ اعظم ہے۔

۳:...... دوبارہ گناہ کا ارتکاب نہ کرنے کا پکا عزم۔ (تفسیر السراج المنیر: ۶۸/۲)

۴:...... لوگوں کے حقوق کی ادائیگی، یا ان سے معاف کرانا۔ (تفسیر ابن کثیر: ۱۶۹/۸، تفسیر الخازن: ۱۲۲/۷)

ریاض الصالحین، صفحہ: ۱۲ میں امام نووی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اگر معصیت کا تعلق آدمی سے ہو تو

اس کے لیے چار شرائط ہیں، تین وہ جن کا اوپر تذکرہ ہوا اور چوتھی یہ کہ لوگوں کے حقوق سے خود کو بری کرے، اگر کسی کا مال یا اس طرح کی کوئی اور چیز لی ہے تو واپس لوٹا دے، اگر کسی پر جھوٹی تہمت وغیرہ لگائی ہے تو اس سے معافی طلب کرے یا اس کو ''حد'' پر قدرت دے اور اگر کسی کی غیبت کی ہے تو اس کی بھی معافی مانگے۔

۵:......توبہ نصوح اور سچی توبہ کی پانچویں شرط یہ ہے کہ بندہ اخلاص کو اختیار کرے، یعنی اللہ کے عذاب کے خوف وڈر اور اس کی مغفرت وثواب کی امید پر گناہوں کو ترک کرے۔

۶:......چھٹی شرط یہ ہے کہ توبہ کا عمل ''توبہ کے وقت'' میں ہو۔

توبہ نصوح کسے کہتے ہیں؟

اللہ تبارک وتعالیٰ نے قرآن کریم میں اپنے بندوں کو ''توبہ نصوح'' کا حکم دیتے ہوئے ارشاد فرمایا:

''یَا أَیُّهَا الَّذِیْنَ آمَنُوْا تُوْبُوْا إِلٰی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا''۔ (التحریم:۸)

ترجمہ: ''اے ایمان والو! توبہ کرو اللہ کی طرف صاف دل کی توبہ''۔(ترجمہ از شیخ الہندؒ)

توبہ نصوح سے کیا مراد ہے؟ آیئے! صحابہ کرام رضی اللہ عنہم، تابعینؒ، سلف صالحینؒ اور مفسرین کرام رحمۃ اللہ علیہم کے اقوال کی روشنی میں اس کا جائزہ لیتے ہیں، ''نصوحًا'' النصح سے ماخوذ ہے، عربی میں سلائی کرنے کو کہتے ہیں، گویا توبہ گناہوں کی پھٹن کو رفو کر کے ایسے ختم کر دیتی ہے، جیسا کہ درزی اور رفو گر کسی پھٹے ہوئے کپڑے کو سلائی ورفو کر کے اس کی پھٹن کو بالکل ختم کر دیتا ہے۔ توبہ نصوح کو سچی، خالص اور محکم و پختہ توبہ بھی کہا جاتا ہے۔ ''نُصوحًا'' کو نون کے ضمہ کے ساتھ بھی پڑھا جاتا ہے، ایسی توبہ کو کہا جاتا ہے کہ جس سے آدمی نصیحت حاصل کرے۔(تفسیر السمعانی:۵/۴۷۷)

امام فراء رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ آیت میں ''نصوحًا'' توبہ کی صفت ہے، معنی یہ ہے کہ وہ توبہ اپنے کرنے والے کو اس بات کی فہمائش کرے کہ ان گناہوں کی طرف لوٹنے کو ترک کرے جن سے اس نے توبہ کی ہے، اور وہ ایسی سچی اور نصیحت آمیز توبہ ہے کہ کرنے والے اپنے نفس کو گناہوں کی گندگی سے پاک کرتے ہیں۔(تفسیر الرازی، سورۃ التحریم:۱/۴۴۹۰)

امام قرطبی رحمۃ اللہ علیہ نے لکھا ہے کہ اصلِ توبہ نصوح خالص ہونا ہے، ملاوٹ سے پاک شہد کو ''عسل ناصح'' کہتے ہیں۔ بعض نے کہا کہ یہ ''نصاحة'' بمعنی سلائی سے ماخوذ ہے، اس سے اخذ کی دو وجہیں ہیں: ۱:......اس توبہ نے اس کی اطاعت الٰہی کو محکم و پختہ کیا ہے، جیسا کہ درزی سلائی سے کپڑے کو محکم و پختہ کر دیتا ہے، ۲:......اس توبہ نے اسے اللہ کے اولیاء کے ساتھ جوڑا، جمع کیا اور ملایا ہے، جیسا کہ درزی سلائی کے ذریعہ کپڑے کے مختلف حصوں کو آپس میں ملاتا اور جوڑ دیتا ہے۔(تفسیر القرطبی:۱۸/۱۹۹)

حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کے سوال پر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ بندہ اپنے کیے

ہوئے گناہ سے نادم ہو کر اللہ کی طرف یوں بھاگے کہ دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹے، یہاں تک کہ دودھ تھنوں میں واپس لوٹ جائے۔ (الدر المنثور: ٦/ ٢٨٤)

حضرت عمرؓ، ابی بن کعبؓ اور معاذ رضی اللہ عنہم فرماتے ہیں: ''**التوبة النصوح أن يتوب ثم لا يعود إلى الذنب كما لايعود اللبن إلى الضرع** ''..... ''توبہ نصوح یہ ہے کہ وہ توبہ کرے اور پھر اس گناہ کی طرف دوبارہ نہ لوٹے، جس طرح دودھ تھنوں میں لوٹ کر واپس نہیں جاتا۔ (تفسیر القرطبی، سورۃ التحریم: ١٨/ ١٩٧)

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ بندہ اپنی سابقہ گناہ آلود زندگی پر نادم ہو، دوبارہ اس کی طرف نہ لوٹنے کے عزم کے ساتھ۔ کلبی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ توبہ نصوح یہ ہے کہ زبان سے استغفار کرے، دل سے ندامت اختیار کرے اور اپنے بدن کو قابو میں رکھے۔ قتادہ رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ سچی نصیحت آمیز توبہ کو نصوح کہتے ہیں۔ (تفسیر الخازن: ٧/ ١٢١)

سعید بن جبیر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: ''نصوح'' مقبول توبہ کو کہتے ہیں، اور توبہ اس وقت تک قبول نہیں کی جاتی ہے، جب تک اس میں تین چیزیں نہ پائی جائیں: ١:......عدم قبولیت کا خوف ہو۔ ٢:......قبولیت کی امید ہو۔ ٣:......طاعات پر ثابت قدمی ہو۔

محمد بن سعید قرظی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: توبہ نصوح چار چیزوں کے پائے جانے کا نام ہے: ١:......زبان سے استغفار کرنا۔ ٢:...... بدن سے گناہوں کو اکھیڑ پھینکنا۔ ٣:......دل سے دوبارہ لوٹنے کے ترک کا اظہار کرنا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے بھی یہی منقول ہے۔ (البحر المدید: ٨/ ١٢٧)۔ ٤:...... برے دوستوں کی صحبت سے دوری اختیار کرنا۔ ٥:......ذو النون رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: اہل خیر کی صحبت اختیار کرنا۔ (تفسیر الخازن: ٧/ ١٢٢)

سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ چار چیزیں توبہ نصوح کی علامت ہیں: ١:......''القلّة'' یعنی گناہوں کو زائل کرنا۔ ٢:...... ''العلّة'' یعنی اللہ کی یاد سے دل بہلانا یا تشویش میں مبتلا ہونا یعنی نادم ہونا۔ ٣:......''الذلّة'' یعنی انکساری اور تابعداری اختیار کرنا۔ ٤:......''الغربة'' یعنی گناہوں سے دوری و جدائی اختیار کرنا۔

فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ: (توبہ کے بعد) گناہ اس کی آنکھوں میں کھٹکے، گویا وہ اُسے برابر دشمنی کی نگاہ سے دیکھ رہا ہو۔

ابوبکر واسطی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: توبہ نصوح (خالص) توبہ کا نام ہے، نہ کہ عقد معاوضہ کا، اس لیے کہ جس نے دنیا میں گناہ کیا اپنے نفس کی سہولت اور مفاد کی خاطر اور پھر توبہ کی اسی نفس کی سہولت کے پیش نظر تو اس کی توبہ اپنے نفس کے لیے ہوگی، نہ کہ اللہ کے لیے۔ (تفسیر الثعلبی: ٩/ ٣٥٠)

ابوبکر مصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: توبہ نصوح مظالم کے لوٹانے یعنی حقوق والوں کے حقوق ادا کرنا، دعویداروں سے حقوق معاف کروانا، اور طاعات پر مداومت کرنے کو کہتے ہیں۔

رابعہ بصریہ رحمۃ اللہ علیہا نے کہا: ایسی توبہ جس میں گناہ کی طرف واپس لوٹنے کا خیال نہ ہو۔ ذوالنون

مصری رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: توبہ نصوح کی تین علامتیں ہیں: ا:...قلتِ کلام۔ ۲:...قلتِ طعام۔ ۳:...قلتِ منام۔

شقیق بلخی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: توبہ نصوح کرنے والا بکثرت اپنے نفس پر ملامت کرے اور ندامت اس سے کبھی جدا نہ ہو، تاکہ وہ گناہوں کی آفتوں سے سلامتی کے ساتھ نجات پا سکے۔

سری سقطی رحمۃ اللہ علیہ نے کہا کہ: توبہ نصوح ایمان والوں کو اصلاحِ نفس کی فہمائش کیے بغیر نہیں ہو سکتی، اس لیے کہ جس کی توبہ درست قرار پائی تو وہ اس بات کو پسند کرے گا کہ سب لوگ اس کی طرح توبہ نصوح کرنے والے ہوں۔ (تفسیر الثعلبی: ۹/۳۵۰)

جنید بغدادی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: توبہ نصوح یہ ہے کہ وہ گناہوں کو ایسے بھول جائے کہ پھر ان کا تذکرہ بھی نہ کرے، کیوں کہ جس کی توبہ درست قرار پاتی ہے وہ اللہ تعالیٰ سے محبت کرنے والا بن جاتا ہے اور جس نے اللہ تعالیٰ سے محبت کی وہ اللہ کے ماسوا کو بھول گیا۔

سہل تستری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: توبہ نصوح اہل سنت والجماعت کی توبہ کا نام ہے، اس لیے کہ بدعتی کی کوئی توبہ نہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی وجہ سے کہ اللہ نے ہر صاحب بدعت کو توبہ کرنے سے محجوب کر دیا ہے۔

فتح موصلی رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: اس کی تین علامتیں ہیں: ا:......نفسانی خواہشات کی مخالفت کرنا۔ ۲:......بکثرت رونا۔ ۳:......بھوک اور پیاس کی مشقت کو برداشت کرنا، یعنی قلتِ طعام و شراب۔ (الکشف والبیان: ۹/۳۵۱)

حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے توبہ نصوح کے بارے میں پوچھا گیا تو آپؓ نے فرمایا کہ آدمی برے عمل سے توبہ کرے اور پھر کبھی اس کی طرف لوٹ کر نہ جائے۔

حضرت حسن رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: توبہ نصوح یہ ہے کہ تو گناہ سے ویسے ہی نفرت کر جیسے تو نے اس سے محبت کی اور جب تجھے یاد آئے تو اس سے توبہ و استغفار کر۔ (تفسیر ابن کثیر: ۸/۱۶۸)

ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ نے کہا: توبہ نصوح یہ ہے کہ زمین اپنی وسعتوں کے باوجود تم پر تنگ ہو جائے، جیسا کہ غزوہ تبوک سے پیچھے رہ جانے والوں نے توبہ کی تھی۔ (تفسیر القرطبی: ۸/۲۸۷)

ابو عبد اللہ رحمۃ اللہ علیہ کہتے ہیں کہ: دس چیزوں کا نام توبہ نصوح ہے: ا:......جہل سے نکلنا، ۲:......اپنے فعل پر نادم ہونا، ۳:......خواہشات سے دوری اختیار کرنا، ۴:......سوال کیے جانے والے نفس کی پکڑ کا یقین، ۵:......ناجائز معاملات کی تلافی کرنا، ۶:......ٹوٹے ہوئے رشتوں کا جوڑنا، ۷:......جھوٹ کو ساقط کرنا، ۸:......برے دوست کو چھوڑنا، ۹:......معصیت سے خلوت اختیار کرنا، ۱۰:......غفلت کے طریق سے عدول کرنا۔ (حقائق التفسیر للسلمی: ۲/۳۳۷)

علامہ شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: توبہ نصوح سے مراد صاف دل کی توبہ ہے، وہ یہ ہے کہ دل میں پھر اس گناہ کا خیال نہ رہے، اگر توبہ کے بعد انہی خرافات کا خیال پھر آیا تو سمجھو کہ توبہ میں کچھ کسر

www.banuri.edu.pk

رہ گئی ہے اور گناہ کی جڑ دل سے نہیں نکلی، رزقنا اللّٰہ منھا حظًا وافرًا بفضله و عونه وھو علیٰ کل شئیءٍ قدیر۔ (تفسیر عثمانی، سورۃ التحریم: ۸)

باعتبارِ وقت وزمانہ کے توبہ کی اقسام

باعتبارِ وقت وزمانہ کے توبہ کی دو قسمیں ہیں: ایک یہ کہ ہر انسان اپنی زندگی میں موت کی ہچکچاہٹ سے پہلے پہلے توبہ کرلے، اس لیے کہ سانسیں اکھڑنے کے بعد کی جانے والی توبہ کا کوئی اعتبار نہیں، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِيْنَ يَعْمَلُوْنَ السَّيِّئَاتِ حَتّٰى إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّيْ تُبْتُ الْآنَ وَلاَ الَّذِيْنَ يَمُوْتُوْنَ وَهُمْ كُفَّارٌ أُوْلٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيْمًا''۔ (النساء: ۱۸)

ترجمہ: ''اور ایسوں کی توبہ نہیں جو کیے جاتے ہیں برے کام، یہاں تک کہ جب سامنے آجائے ان میں سے کسی کی موت تو کہنے لگا میں توبہ کرتا ہوں اب، اور نہ ایسوں کی توبہ جو مرتے ہیں حالت کفر میں، ان کے لیے ہم نے تیار کیا ہے عذاب دردناک۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''إنّ اللّٰه يقبل توبة العبد مالم يغرغر''۔ (سنن الترمذي، كتاب الدعوات، رقم: ۳۵۳۷)

ترجمہ: ''بے شک اللہ بندے کی توبہ اس وقت تک قبول فرماتے ہیں جب تک اس کی روح گلے تک نہ پہنچے (یعنی جب تک اس کی سانسیں نہ اکھڑ جائیں)''۔

توبہ کی دوسری قسم وقت کے اعتبار سے یہ ہے کہ تمام مخلوق کی توبہ اس وقت تک قابلِ قبول ہے جب تک سورج مغرب سے طلوع نہ ہونے لگے اور جب سورج مغرب سے طلوع ہونے لگ جائے تو پھر اس وقت کسی کی بھی توبہ قبول نہیں کی جائے گی۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''من تاب قبل أن تطلع الشمس من مغربها تاب اللّٰه عليه''.... یعنی ''جس نے سورج کے مغرب سے طلوع ہونے سے پہلے توبہ کی، اللہ تعالیٰ اس کی توبہ کو قبول فرمائیں گے۔'' (صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، رقم: ۲۸۶۱)

توفیقِ توبہ کے اعتبار سے لوگوں کی قسمیں

اللہ تعالیٰ کی طرف سے توبہ کی توفیق ملنے اور نہ ملنے کے اعتبار سے لوگوں کی مختلف قسمیں بنتی ہیں:

۱:...... ایک قسم تو ان لوگوں کی ہے جن کو زندگی بھر سچی توبہ کی توفیق نہیں ملتی، ان کی تمام عمر سنِ شعور سے لے کر موت تک پورا عرصہ گناہوں اور معصیت میں صَرف ہوجاتا ہے، یہاں تک کہ اسی حالت میں ان کو موت آجاتی ہے، یہ بدبخت لوگوں کی حالت ہے۔

۲:...... ان سے قبیح اور برے وہ لوگ ہیں جن کو ابتدا سے لے کر آخر تک تمام عمر نیک اعمال کی

توفیق ملتی رہی، پھر آخری وقت میں کسی برے عمل میں مبتلا ہو جائیں، یہاں تک کہ وہ اسی برے عمل کو کرتے ہوئے مر جائیں، جیسا کہ صحیح حدیث میں آیا ہے کہ تم میں سے بعض لوگ اہل جنت والے اعمال اختیار کرتے ہیں، یہاں تک کہ اس کے اور جنت کے درمیان ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر اس پر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ جہنمی لوگوں والا کوئی عمل اختیار کرتا ہے، جس کی وجہ سے وہ جہنم میں داخل ہو جاتا ہے۔ (صحیح البخاری، کتاب الأنبیاء، باب قول اللّٰہ تعالیٰ: وإذ قال ربک للملائکۃ إني جاعل في الأرض خلیفۃ، رقم: ۳۳۳۲)

۳:......ایک تیسری قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنا کل متاع عزیز اور ساری زندگی غفلت و دھوکے میں گزار دیتے ہیں، یہاں تک کہ انہیں کسی عملِ صالح کی توفیق مل جاتی ہے اور وہ اس پر انتقال کر جاتے ہیں، یہ وہ لوگ ہیں جو عمر بھر جہنمی لوگوں والے اعمال کرتے رہے، یہاں تک کہ ان کے اور جہنم کے درمیان صرف ایک بالشت کا فاصلہ رہ جاتا ہے، پھر تقدیر غالب آجاتی ہے اور وہ اہلِ جنت جیسا عمل اختیار کر کے جنت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ (حوالہ سابق)

یہ بات تو واضح ہے کہ اعمال کا دار و مدار خاتمہ پر ہے، اعتبار خیر یا شر پر خاتمے کا ہے۔ حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بندے کے ساتھ بھلائی کا معاملہ فرماتے ہیں تو اسے کسی نیک عمل کی توفیق عنایت فرما دیتے ہیں، پھر اسی پر اس کی روح قبض کر لیتے ہیں۔ (سنن الترمذي، کتاب القدر، رقم: ۲۱۴۲)

۴:......ایک قسم ان لوگوں کی ہے جو اپنی زندگی کا لمحہ لمحہ اور پل پل اللہ کی اطاعت و فرمانبرداری میں گزارتے ہیں، پھر موت سے پہلے ان کو متنبہ کیا جاتا ہے کہ اب اللہ سے ملاقات کا وقت آن پہنچا ہے تو وہ اس ملاقات کی تیاری میں لگ جاتے ہیں اور ایسا زادِ راہ و توشہ اختیار کرتے ہیں جو اس ملاقات کے شایانِ شان ہو۔ یہ لوگوں کی سب سے بہترین اشرف و اعلیٰ قسم ہے۔ حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ: جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم پر ﴿إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللّٰهِ وَالْفَتْحُ﴾ (النصر:۱) نازل ہوئی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا سے پردہ کرنے کے بارے میں اشارہ فرمایا گیا ہے تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم اپنی تمام تر صلاحیتیں اور کوششیں آخرت میں کام آنے والے اعمال میں صرف کرنے لگے (جیسا کہ نبوت ملنے کے بعد سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا معمول تھا) (الدر المنثور، سورۃ النصر: ۵/۷۲۲-۷۲۳۔ تفسیر ابن کثیر: ۶/۵۶۲)

حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حیات کے آخری لمحات میں اٹھتے، بیٹھتے، آتے جاتے ہر وقت ''سبحان اللّٰہ و بحمدہ أستغفر اللّٰہ و أتوب إلیہ '' کہا کرتے تھے، میں نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کثرت کے بارے میں پوچھا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: مجھے اس کا حکم دیا گیا ہے، پھر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے سورۂ نصر تلاوت فرمائی۔ (تفسیر ابن کثیر، النصر: ۶/۵۶۴۔ تفسیر القرطبی، النصر: ۱۰/۱۶۶)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی عادتِ شریفہ یہ تھی کہ ہر سال رمضان میں دس دن اعتکاف فرماتے اور حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ایک دفعہ قرآن مجید سناتے تھے، وصال والے سال بیس دن اعتکاف کیا اور دو دفعہ قرآن پاک

کا دور فرمایا اور آپ ﷺ فرماتے تھے کہ اب اللہ سے ملاقات کا وقت قریب ہے، پھر آپ ﷺ نے حجۃ الوداع، آخری حج ادا فرمایا۔ اس موقع پر ارشاد فرمایا: لوگو! مجھ سے حج کے مسائل سیکھو، شاید میں اس سال کے بعد دوبارہ حج نہ کرسکوں، یا آپ سے نہ مل پاؤں۔ (صحیح مسلم، کتاب الحج، رقم: ۳۱۳۷)

اس کے علاوہ آپ ﷺ نے قرآن وسنت کو مضبوطی سے پکڑنے اور ان پر عمل کرنے کا حکم دیا اور مدینہ واپس آنے کے کچھ ہی عرصہ بعد دنیا سے پردہ فرمالیا۔ (تفسیر القرطبی: ۲۰/ ۱۶۷)

گناہوں سے توبہ کا طریقہ

علماء کرام نے فرمایا کہ بندہ جن گناہوں میں مبتلا تھا، ان سے توبہ کا طریقہ یہ ہے دیکھا جائے کہ اس گناہ کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے یا بندوں کے حقوق سے؟ اگر اللہ تعالیٰ کے حقوق میں سے کوئی حق ہے، جیسا کہ ترکِ نماز کا مرتکب تھا تو اس گناہ سے توبہ اس وقت تک صحیح نہیں ہوسکتی، جب تک قلبی ندامت کے ساتھ فوت شدہ نمازوں کی قضا نہ پڑھ لے، اسی طرح روزہ اور زکوٰۃ وغیرہ کا معاملہ ہے کہ جب تک سابقہ روزوں اور زکوٰۃ کی ادائیگی نہیں کرے گا، اس وقت تک اس کی توبہ کامل نہیں ہوگی۔ اگر گناہ کسی کو ناحق قتل کا ہے تو اپنے آپ کو قصاص کے لیے پیش کرے، اگر اولیاءِ مقتول نے اس کا مطالبہ کیا ہے تو، ورنہ دیت ادا کرے۔ اگر کسی پر ایسی جھوٹی تہمت لگائی ہے جس سے ''حد'' لازم آتی ہے تو اپنے آپ کو اس کے لیے پیش کرے۔ اگر قتل اور تہمت میں اسے معاف کردیا گیا تو اخلاص کے ساتھ ندامت اور آئندہ نہ کرنے کا عزم کافی ہوجائے گا۔ اسی طرح چور، ڈاکو، شرابی اور زانی بھی توبہ کرلیں اور ان گناہوں کو ترک کریں اور پنی اصلاح کریں تو ان کی توبہ درست ہوجائے گی۔ اگر گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے تو اگر قدرت رکھتا ہو تو فوراً صاحب حق کا حق ادا کردے، اگر فوری ادائیگی کی قدرت نہ ہو تو جتنی جلدی ممکن ہو قدرت ہونے پر ادائیگی کا عزم کرلے۔ اگر کسی مسلمان کو نقصان پہنچانے کا سبب اختیار کیا ہے تو فوری طور سے اس سببِ نقصان کو زائل کردے، پھر اس مسلمان بھائی سے معافی طلب کرے اور اس کے لیے استغفار بھی کرے، اور اگر صاحب حق نے اس کو معاف کردیا تو یہ اس گناہ سے بری ہوجائے گا۔ اسی طرح اگر کسی دوسرے کو کسی بھی طرح کا ضرر پہنچایا تھا یا ناحق اسے ستایا تھا اور اس صاحب حق سے نادم ہوکر معافی مانگی، اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا عزم بھی ہو اور برابر اس سے معافی طلب کرتا رہا، یہاں تک اس مظلوم نے اسے معاف کردیا تو اس کے وہ گناہ معاف ہوجائیں گے۔ (تفسیر القرطبی: ۱۸/ ۱۹۹، ۲۰۰)

یہی حال باقی تمام معاصی وگناہوں کا ہے کہ اگر حقوق اللہ سے تعلق ہے تو ذکر کردہ شرائط کے مطابق توبہ کرے اور اگر بندوں کے حقوق کا معاملہ ہو تو مذکورہ طریقۂ توبہ کو اپنانے کے ساتھ حقوق کی ادائیگی کرے یا معاف کروائے۔

سلفِ صالحین کا طرزِ عمل

سلفِ صالحین کی رائے یہ کہ جس شخص کی موت کسی نیک عمل جیسے رمضان کے روزے یا حج یا عمرہ کے بعد واقع ہوجائے تو اللہ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ جنت میں جائے گا۔ خود اکابرین سلفِ صالحین عمر بھر نیک اعمال میں صَرف کرنے کے باوجود موت کے وقت توبہ واستغفار کا اہتمام کرتے اور اپنا عمل استغفار اور کلمہ طیبہ ''لاإلٰه إلا اللّٰه'' پر ختم کیا کرتے تھے۔ علاء بن زیاد کا جب آخری وقت آپہنچا تو رونے لگے، کسی نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی تو فرمایا: اللہ کی قسم! میری یہ خواہش وچاہت ہے کہ توبہ کے ذریعے موت کا استقبال کروں۔ ان سے عرض کیا گیا کہ اللہ آپ پر رحم فرمائے، آپ ایسا کرلیں، انہوں نے وضو کے لیے پانی منگوایا، وضو کیا، پھر نئے کپڑے منگوائے، انہیں زیب تن کیا، پھر قبلہ کی جانب رخ کرکے اپنے سر کو دو مرتبہ جھکایا، پھر پہلو کے بل لیٹ گئے اور روح پرواز کرگئی۔ عامر بن عبداللہؒ وقتِ اجل رونے لگے اور فرمانے لگے: ایسے ہی وقت کے لیے عمل کرنے والے عمل کرتے ہیں۔ اے! اللہ! میں آپ سے اپنی کمی اور کوتاہی کی معافی چاہتا ہوں اور اپنے تمام گناہوں سے توبہ کرتا ہوں، پھر اس کے بعد مسلسل ''لاإلٰه إلا اللّٰه'' کا ورد کرتے رہے، یہاں تک کہ روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی۔ عمرو بن العاص رحمۃ اللہ علیہ نے موت کے وقت فرمایا: اے اللہ! آپ نے ہمیں طاعت کا حکم دیا، ہم نے اس کی کوتاہی کی اور آپ نے معاصی سے منع کیا ہم ان کا ارتکاب کر بیٹھے، ہمارے لیے سوائے آپ کی معافی ومغفرت کے اور کوئی چارہ کار نہیں، پھر اس کے بعد ''لاإلٰه إلا اللّٰه'' کا ورد کرتے رہے، یہاں تک کہ موت نے آلیا۔

توبہ کی دعوت

برادرانِ عزیز! آج انسان گناہ ومعاصی کے بحرِ عمیق میں ڈوبا ہوا ہے، نفس بشر خطا ولغزش سے بچا ہوا نہیں، لیکن مایوس ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں، ہر وہ شخص جس نے گناہ ومعصیت کے ذریعے اپنے نفس پر ظلم وزیادتی کی ہے، اسے اس بات کی خوشخبری ہو کہ اللہ پاک اپنے پاک کلام میں انہیں توبہ ورجوع کی دعوت بھی دے رہے ہیں اور یہ اعلان بھی فرما رہے ہیں کہ وہ تمام گناہوں کو معاف کرنے والے ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ کا ارشادِ گرامی ہے:

''قُلْ يَا عِبَادِيَ الَّذِيْنَ أَسْرَفُوْا عَلٰى أَنْفُسِهِمْ لَا تَقْنَطُوْا مِنْ رَّحْمَةِ اللّٰهِ إِنَّ اللّٰهَ يَغْفِرُ الذُّنُوْبَ جَمِيْعًا إِنَّهٗ هُوَ الْغَفُوْرُ الرَّحِيْمُ وَأَنِيْبُوْا إِلٰى رَبِّكُمْ وَأَسْلِمُوْا لَهٗ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَّأْتِيَكُمُ الْعَذَابُ ثُمَّ لَا تُنْصَرُوْنَ''۔ (الزمر: ۵۳-۵۴)

ترجمہ:...... ''کہہ دے: اے میرے بندو! جنہوں کہ زیادتی کی ہے اپنی جان پر، آس مت توڑو اللہ کی مہربانی سے، بے شک اللہ بخشتا ہے سب گناہ، وہ جو ہے وہی گناہ معاف

کرنے والا مہربان ہے، اور رجوع ہو جاؤ اپنے رب کی طرف اور اس کی حکم برداری کرو پہلے اس سے کہ آئے تم پر عذاب، پھر کوئی تمہاری مدد کو نہ آئے گا۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

ایک اور جگہ ارشادِ ربانی ہے:

’’وَإِنِّیْ لَغَفَّارٌ لِّمَنْ تَابَ وَآمَنَ وَعَمِلَ صَالِحًا ثُمَّ اهْتَدٰی‘‘۔ (طٰہٰ:۸۲)

ترجمہ) اور میری بڑی بخشش ہے اس پر جو توبہ کرے اور یقین لائے اور کرے بھلے کام، پھر راہ پر رہے۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما اس آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں:

’’مَن آیس عبادَ اللّٰہ بعد ھذا فقد جحد کتابَ اللّٰہ‘‘۔ (تفسیر ابن کثیر:۷/۱۰۸)

ترجمہ: ’’جس نے اس کے بعد اللہ کے بندوں کو توبہ سے مایوس کیا تو گویا اس نے کتاب اللہ کا انکار کیا‘‘۔

حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ جب سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کی عیادت کے لیے آئے تو ان سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ میرے جیسے کی مغفرت فرمائیں گے؟ تو حماد بن سلمہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا: اللہ کی قسم! اگر مجھے اللہ اور اپنے والدین میں کسی ایک کا محاسبہ اختیار کرنے کا کہا جائے تو میں اللہ کے محاسبہ کو اختیار کروں گا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ میرے ساتھ میرے والدین سے زیادہ رحم کرنے والے ہیں۔

ابنِ قدامہ رحمۃ اللہ علیہ نے ’’کتاب التوابین‘‘ میں ایک نوجوان کا قصہ نقل کیا ہے کہ رجاء بن سور کہتے ہیں: ایک دن صالح کی مجلس میں بیٹھے ہوئے تھے اور وہ گفتگو فرما رہے تھے، انہوں نے اپنے پاس بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے کہا: اے نوجوان (قرآن میں سے) پڑھو، اس نے اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کی تلاوت کی:

’’وَأَنْذِرْهُمْ یَوْمَ الْآزِفَةِ إِذِ الْقُلُوْبُ لَدَی الْحَنَاجِرِ كَاظِمِیْنَ مَا لِلظّٰلِمِیْنَ مِنْ حَمِیْمٍ وَّلَا شَفِیْعٍ یُّطَاعُ‘‘۔ (غافر:۱۸)

ترجمہ: ...... ’’اور خبر سنا دے ان کو اس نزدیک آنے والے دن کی جس وقت دل پہنچیں گے گلوں کو تو وہ دبا رہے ہوں گے، کوئی نہیں گناہ گاروں کا دوست اور نہ سفارشی کہ جس کی بات مانی جائے۔ (ترجمہ از شیخ الہندؒ)

شیخ صالح رحمۃ اللہ علیہ نے آیت کی تفسیر میں فرمایا: جب رب العلمین خود لوگوں سے مطالبہ کرنے والے ہوں تو اس دن ظالموں کے لیے کیسے کوئی دوست سفارش کرنے والا ہوگا؟ اگر تم لوگ وہ منظر دیکھ لو کہ جب گناہ گاروں کو زنجیروں اور بیڑیوں میں جکڑ کر ننگے پیر اور برہنہ حال جہنم کی طرف لایا جائے گا، ان کے چہرے سیاہ اور آنکھیں پیلی اور جسم خوف سے پگھلے جا رہے ہوں گے اور وہ پکار رہے ہوں گے: اے ہماری ہلاکت! اے ہماری موت! یہ ہمارے ساتھ کیا ہوا؟ ہمیں کہاں لے جایا جا رہا ہے؟، وہ کیا ہی

منظر ہوگا جب ملائکہ انہیں آگ کی لگاموں کے ذریعے ہانکتے لے جارہے ہوں گے، کبھی منہ کے بل انہیں گھسیٹا جا رہا ہوگا اور کبھی اس حال میں کہ وہ خون کے آنسو رو رہے ہوں گے، دل ان کے حیران اور وہ تکلیف سے چلا رہے ہوں گے، وہ ایک ایسا خوفناک منظر ہوگا کہ کوئی آنکھ اسے دیکھنے کی متحمل نہیں ہوسکتی، کسی دل میں اتنا حوصلہ نہیں کہ بے قرار نہ ہو اور قدم اس دن کی شدت کی وجہ سے بے قابو ہوں گے۔ پھر روتے ہوئے فرمانے لگے: کیا ہی برا منظر اور کیا ہی برا انجام ہوگا۔ ان کے ساتھ سامعین بھی رونے لگے، حاضرین مجلس میں ایک گناہ و مستی میں ڈوبا ہوا جوان بھی بیٹھا ہوا تھا، اس نے شیخ کی یہ گفتگو سن کر کہا: اے ابوالبشر! کیا یہ سارا کچھ جو آپ نے بیان کیا قیامت کے دن ہوگا؟ شیخ نے فرمایا، ہاں! اے میرے بھتیجے! اس سے بھی بڑھ کر حالات ہوں گے، مجھے یہ بات پہنچی ہے کہ وہ آگ میں چیخ رہے ہوں گے، یہاں تک کہ چیختے چیختے ان کی آواز بیٹھ جائے گی اور عذاب کی شدت کی وجہ سے صرف ایک بھنبناہٹ باقی رہ جائے گی۔ اس غافل جوان نے یہ سن کر ایک چیخ ماری اور کہا: اے اللہ! ہائے میری زندگی کے غفلت کے ایام، ہائے میرے آقا و مولا! میں نے اطاعت میں کوتاہی سے کام لیا، ہائے افسوس! میں نے اپنی عمر دنیا کی فانی زندگی کے لیے برباد کردی، اس کے بعد اس جوان نے رونا شروع کردیا اور قبلہ رخ ہوکر کہنے لگا: اے اللہ! آج میں ایسی توبہ کے ساتھ آپ کی طرف رجوع کرتا ہوں جس میں کسی ریا کا شائبہ نہیں۔ اے اللہ! میری توبہ قبول فرما اور میرے سابقہ معاصی کو معاف فرما اور میری لغزشوں سے درگزر فرما! مجھ پر اور حاضرین مجلس پر رحم فرما اور اپنا فضل و کرم ہمارے شامل حال فرما۔ اے ارحم الراحمین! اے اللہ! آپ کے لیے میں اپنی گردن سے گناہوں کے بار اتار پھینکتا ہوں اور اپنے تمام اعضاء و جوارح اور سچے دل کے ساتھ رجوع کرتا ہوں۔ اے اللہ! اگر آپ میری توبہ قبول نہیں کریں گے تو یہ میری ہلاکت اور بربادی ہے، اس کے بعد وہ جوان بے ہوش ہوکر گر پڑا، اُسے وہاں سے منتقل کیا گیا۔ شیخ صالح اپنے ساتھیوں کے ساتھ کچھ دنوں تک اس کی عیادت کرتے رہے، پھر اس جوان کا انتقال ہوا، اس جوان کے جنازہ میں خلقِ خدا نے شرکت کی، وہ روتے ہوئے اس کے لیے دعائے مغفرت کر رہے تھے۔ شیخ صالح گاہے بگاہے اس جوان کا اپنی مجلس میں تذکرہ کرتے اور فرماتے: میرے والدین اس پر قربان ہوں، یہ قرآن کا قتیل ہے، یہ وعظ اور غم و حزن کا قتیل ہے (یعنی قرآن کی اس آیت اور اس کی تفسیر نے اس نوجوان پر اتنا اثر ڈالا کہ وہ قیامت کے دہشت ناک احوال کے خوف سے جان سے گزر گیا) راوی کہتے ہیں کہ ایک شخص نے موت کے بعد ان کو خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ تمہارا کیا بنا؟ اس نے کہا کہ شیخ صالح کی مجلس کی برکت میرے شامل حال رہی اور میں اللہ کی وسیع رحمت میں داخل ہوا، یعنی میری مغفرت کردی گئی۔ اللہ تعالیٰ ہم سب مسلمانوں کو گناہ کو گناہ سمجھ کر اس سے بچنے اور سچی توبہ کی توفیق دے اور تمام امتِ مسلمہ کی مغفرت فرمائے۔ (آمین)

کیا اسلام' جدید تعلیم کے خلاف ہے؟

مولانا محمد یعقوب خاصخیلی

موجودہ زمانے میں مغربی دانشور اسلام کے خوبصورت چہرے کو بدنما ثابت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگانے میں مصروف ہیں ۔ وہ یہ چاہتے ہیں کہ کسی بھی طرح اسلام کو بدنام کریں، اسلام کا نام ونشان مٹادیں ۔ وہ ہر اس مہم کا حصہ بن جاتے ہیں جو اسلام کی بدنامی کا باعث بنے، اس لیے وہ کسی بھی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے ۔ ان میں سب سے بڑا حربہ یہ ہے کہ وہ جدید تعلیم کے نام پر مسلمانوں کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کی ناکام کوشش کرتے ہیں ۔ وہ اسلام کے خلاف تکرار کے ساتھ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ اسلام جدید علوم کے خلاف ہے، اسلام اور جدید علوم آپس میں ضد ہیں ۔ آیئے! ہم ذرا تاریخ میں جھانکتے ہیں کہ کیا اسلام کی بدولت جدید علوم کی حوصلہ شکنی ہوئی یا اسلام کی بدولت سائنس اور ٹیکنالوجی اور نئے علوم کی راہیں کھلیں؟

اسلام سے قبل یونانی حکماء جدید نے علوم کی جانب توجہ دی ۔ اس زمانے میں سقراط، افلاطون، ٹالیس بطلیموس اور ارسطو وغیرہ نے زمین کی سطح، گولائی، اجرام فلکی اور دیگر مختلف امور پر مشاہدات اور تحقیقات کی مدد سے نظریات پیش کیے اور معلومات کا بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ۔ لیکن یونانیوں کے بعد عیسائیت کے دور میں سائنسی اور جدید علوم زوال کا شکار رہے ۔ اس دور میں عیسائی علماء نے یہ جدید نظریات اور علوم باطل قرار دیئے، ان کی کتابیں جلادی گئیں اور اس کی تعلیم ممنوع قرار دے دی گئی ۔ نتیجۃً یورپ اور وہ علاقے جہاں عیسائیوں کی حکومت تھی، جہالت کے اندھیروں میں ڈوب گئے ۔ ایک ایسے زمانے میں جہاں عیسائی پادریوں کے جبر واستبداد سے علم وحکمت کا نام ونشان مٹ چکا تھا، عین اسی زمانے میں اللہ تعالیٰ نے انسانیت کی ذلت وپستی کی حالت پر رحم کھا کر جناب حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ورسول بنا کر علم وحکمت کے بے شمار علوم عطا فرما کر بھیجا ۔ جن کی وحی کی ابتدا ہی لفظ ''اِقْـرَأْ''..... ''پڑھیے'' سے ہوئی ۔ حالانکہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم امی تھے، پھر آقا صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ''بے شک میں معلّم بنا کر بھیجا گیا ہوں ۔'' نیز فرمایا: ''بے شک حکمت کے موتی مومن کی گم شدہ متاع ہے، جہاں سے ملے وہ اس کے حاصل کرنے کا سب سے زیادہ حق دار ہے ۔'' اللہ تعالیٰ نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآنِ مجید

جیسی عظیم الشان کتاب نازل کی، اس جیسی کوئی کتاب کسی نبی پر نازل نہیں ہوئی۔ اس کتاب میں اللہ تعالیٰ نے تمام انسانیت کو کائنات میں غور وفکر کرنے کی ترغیب اور بہت تاکید کی۔ متعدد آیات میں بنی آدم کو حکم دیا ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کی مخلوقات میں غور وفکر کرو! اس کی نشانیوں کو غور سے دیکھو!

قرآنِ حکیم کی اس ترغیب کی بدولت مسلمانوں نے علم کے حصول اور اس کو پھیلانے کا بیڑا اٹھایا۔ یہی وجہ ہے آٹھویں صدی عیسوی سے لے کر تیرھویں صدی تک کا یہ زمانہ علم وحکمت کا اسلامی دور تھا۔ اس دور میں فلسفہ، طب اور سائنس کے فراموش شدہ علوم کو مسلمانوں نے نہ صرف زندہ کیا، بلکہ اپنی جدید تحقیقات سے ان کو ایک نئی سمت دی۔ ابو ہاشم خالد بن یزید- جسے علم کیمیا کا بانی کہا جاتا ہے، علم کیمیا اور طب کے بہت بڑے عالم تھے- انہوں نے اس موضوع کے متعلق کئی کتابیں لکھیں۔ البیرونی نے ان کو مسلمانوں کا سب سے پہلا حکیم تسلیم کیا۔ جابر بن حیان جو حضرت جعفر صادق رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، انہوں نے گندھک وغیرہ کے تیزاب اور دھاتوں کو رقیق اور پھر گیس بنانے کا طریقہ دریافت کیا۔ فائر پروف اور واٹر پروف کاغذ بھی انہوں نے ایجاد کیا۔ انہوں نے بھی اپنے فن کے متعلق سو کے قریب کتابیں لکھیں۔ اس مسلمان سائنس دان کی کتابوں کا انگریزی زبان میں ترجمہ بھی کیا گیا۔ ایک اور بھی مسلمان گزرے ہیں جن کا نام ابوعلی حسن بن الہیثم ہے، جنہیں یورپ والے ملک الہیزن کہتے ہیں۔ اس طرح سے کئی ایسے مسلمان سائنسدان گزرے ہیں۔

اس زمانے میں کئی مسلمان سائنسدان حیران کن طور پر مختلف ایجادات کے موجد بنے۔ ابن الہیثم، جابر بن حیان، ابنِ سینا، المقدسی، البیرونی اور ابنِ بطوطہ جیسے بڑے مسلمان سائنسدانوں نے جدید مشاہدات اور تحقیقات کی روشنی میں وہ علوم دریافت کیے کہ آج بھی ان کی برابری کوئی نہیں کرسکتا۔ یورپ کی موجودہ سائنسی ترقی ان مسلم سائنسدانوں کی مرہونِ منت ہے۔ ان کی کتابیں یورپ کے لیے ایک رہنما کی حیثیت اختیار کرگئیں۔ آج بھی الشفاء اور القانون کے حصے ان کے نصاب میں شامل ہیں۔ کیا یہ سب مسلمانوں کی محنت نہیں تھی، جسے آج جدید دور میں ان کی کتابوں سے استفادہ کرکے اپنے آپ کو سائنسدان کہلانے لگے۔

اسلام نے دنیا سے جہالت کی تاریکی دور کردی۔ اسلامی تعلیمات کا منشا ہی یہی تھا کہ انسان اپنے اردگرد کے ماحول اور اپنے آپ میں غور کریں۔ اسلام کے آتے ہی سوچ کے دھارے بدل گئے۔ جدید سائنسی ترقی نے ہمیں غور وفکر کے نئے وسائل مہیا کیے ہیں، چنانچہ جوں جوں سائنس ترقی کرتی جارہی ہے، قرآن اپنے معجزہ ہونے کے لیے دلائل مہیا کرتا جاتا ہے۔ آج اگر مسلمان جدید علوم میں پیچھے ہیں، یہ ان کی اپنی کوتاہی اور اسلامی تعلیمات سے لاپرواہی ہے۔ ان کی کوتاہی کو اسلام کے کھاتے میں ہرگز نہیں ڈالا جاسکتا۔ مگر اس ساری صورتِ حال کے بعد یہ اندازہ بخوبی لگایا جاسکتا ہے کہ اسلام دشمن قوتوں کے اس دعوے میں کتنی صداقت ہے کہ ''اسلام جدید علوم کے خلاف ہے؟''۔

فریضۂ زکاۃ اور اس کی ادائیگی

(دوسری اور آخری قسط)

مفتی محمد راشد ڈَسکوی

زکاۃ کن افراد پر اور کن افراد کے لیے ہے؟

دنیا میں بسنے والے افراد کا جائزہ لیا جائے تو ان تمام افراد کو تین طبقات میں تقسیم کیا جا سکتا ہے:

۱:...... مالدار افراد، جن پر مخصوص شرائط کے بعد زکاۃ فرض ہوتی ہے۔

۲:...... دوسرے غریب افراد، جن پر زکاۃ فرض نہیں ہوتی اور ان کے لیے زکاۃ لینا جائز ہے۔

۳:...... تیسرے وہ متوسط درجے کے افراد، جن پر زکاۃ تو فرض نہیں ہوتی، لیکن ان کے لیے زکاۃ لینا بھی جائز نہیں۔

اب ان تینوں قسم کے افراد کو پہچاننے کے لیے کیا معیار اور کسوٹی ہے کہ اس کے مطابق ہر طبقے والا اپنی حالت اور کیفیت کو پہچان کر اس کے مطابق اپنے اوپر عائد احکاماتِ الٰہیہ کو پہچان کر پورا کر سکے؟ اس کے لیے دو چیزوں کا جاننا ضروری ہے: ایک تو وہ کون سی اشیا یا اموال ہیں جن کے ہوتے ہوئے زکاۃ فرض ہوتی ہے؟ اور دوسرا وہ اشیا یا اموال کتنی مقدار میں ہوں کہ ان کے ہوتے ہوئے کوئی شخص زکاۃ دینے والا یا زکاۃ لینے والا ٹھہرتا ہے؟ ان میں سے پہلی چیز کو ''اموالِ زکاۃ'' اور دوسری چیز کو ''نصابِ زکاۃ'' سے پہچانا جاتا ہے۔ ذیل میں اموالِ زکاۃ اور نصابِ زکاۃ کی تفصیل ذکر کی جاتی ہے:

اموالِ زکاۃ

اموالِ زکاۃ سے مراد وہ اشیا یا اموال ہیں جن کا (مخصوص مقدار میں) مالک ہونے پر زکاۃ فرض ہوتی ہے۔ وہ کل چار قسم (کی اشیا یا اموال) ہیں:

۱:...... سونا، خواہ وہ زیور کی شکل میں ہو، ڈلی ہو، اینٹ ہو یا کسی برتن وغیرہ کی شکل میں ہو، چاہے استعمال میں ہو یا نہ ہو، خالص ہو یا اس میں کوئی کھوٹ یا ملاوٹ وغیرہ ہو، بہرصورت یہ (سونا) مالِ زکاۃ ہے۔

۲:...... چاندی، خواہ وہ زیور کی شکل میں ہو، ڈلی ہو، اینٹ ہو یا کسی برتن وغیرہ کی شکل میں ہو، چاہے استعمال میں ہو یا نہ ہو، خالص ہو یا اس میں کوئی کھوٹ یا ملاوٹ وغیرہ ہو، بہرصورت یہ

(چاندی) مالِ زکاۃ ہے۔

۳:......نقدی، اپنے ملک کی ہو یا کسی اور ملک کی، اپنے پاس ہو یا بینک میں، چیک ہو یا ڈرافٹ، نوٹ ہو یا سکّے، کسی کو قرض دی ہوئی ہو (بشرطیکہ ملنے کی امید ہو) ان تمام صورتوں میں یہ (نقدی) مالِ زکاۃ ہے۔

۴:...... مالِ تجارت، یعنی تاجر کی دکان کا ہر وہ سامان جو بیچنے کی نیت سے خریدا گیا ہو اور تاحال اس کے بیچنے کی نیت باقی ہو، تو یہ (مالِ تجارت) مالِ زکاۃ ہے۔ (اور اگر مذکورہ مال یعنی مالِ تجارت کو گھر کے استعمال کے لیے رکھ لیا، یا اس کے بارے میں بیٹے یا دوست وغیرہ کو ہدیہ میں دینا طے کرلیا، یا پھر ویسے ہی اس مال کے بارے میں بیچنے کی نیت نہ رہی تو یہ مال، مالِ زکاۃ نہ رہا)۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، أموال الزکاۃ، ج:۲، ص:۱۰۰، دار إحیاء التراث العربی)

یہ کل چار قسم کے اموال ہیں جن پر (مخصوص مقدار تک پہنچنے پر) زکاۃ فرض ہوتی ہے، البتہ اگر کوئی مقروض ہو تو قرضوں کی ادائیگی کے بعد بچنے والے اموال کی زکاۃ دی جائے گی۔

نصابِ زکاۃ

سطورِ بالا میں معاشرے کے تین طبقات کو بیان کیا گیا تھا، جن کی تمیز ’’نصاب‘‘ کے مالک ہونے پر موقوف ہے، اس تمیز کو سمجھنے کے لیے یہ جاننا ضروری ہے کہ نصاب دو قسم کا ہوتا ہے، ایک نصاب کا تعلق ’’زکاۃ دینے والے‘‘ سے ہے اور دوسرے نصاب کا تعلق ’’زکاۃ لینے والے‘‘ سے ہے، دونوں قسم کے نصابوں میں کچھ فرق ہے، جو ذیل میں لکھا جارہا ہے:

پہلی قسم کا نصاب (زکاۃ دینے والے کے لیے)

اللہ رب العزت نے اپنے غریب بندوں کے لیے امراء پر ان کے اموال کی ایک مخصوص مقدار پر زکاۃ فرض کی ہے، جس کو نصاب کہا جاتا ہے۔ اگر کوئی شخص اس نصاب کا مالک ہو تو اس پر زکاۃ فرض ہے اور اگر کسی کے پاس اس نصاب سے کم ہو تو اس شخص پر زکاۃ فرض نہیں ہے۔ اس نصاب میں صرف وہ (چاروں) اموالِ زکاۃ شامل ہیں جو اوپر ذکر کیے گئے۔ چاروں قسم کے اموالِ زکاۃ کی وہ مخصوص مقداریں جن پر زکاۃ فرض ہوتی ہے، ذیل میں لکھی جاتی ہیں:

۱:......اگر کسی کے پاس صرف ’’سونا‘‘ ہو اور کوئی مال (مثلاً: چاندی، نقدی یا مالِ تجارت) نہ ہو تو جب تک سونا ساڑھے سات تولے (87.479 گرام) نہ ہو جائے اس وقت تک زکاۃ فرض نہیں ہوتی، اور اگر سونا اس مذکورہ وزن تک پہنچ جائے تو زکاۃ فرض ہو جاتی ہے۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، صفۃ الزکاۃ، ج:۲، ص:۱۰۵، دار إحیاء التراث العربی)

۲:......اگر کسی کے پاس صرف ’’چاندی‘‘ ہو اور کوئی مال (سونا، نقدی یا مالِ تجارت) نہ

ہوتو جب تک چاندی ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) نہ ہو جائے اس وقت تک زکاۃ فرض نہیں ہوتی، اور اگر چاندی اس مذکورہ وزن تک پہنچ جائے تو زکاۃ فرض ہو جاتی ہے۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، أموال الزکاۃ:، ج:۲،ص:۱۰۰، دار إحیاء التراث العربی)

۳:......اگر کسی کے پاس صرف ''نقدی'' ہو اور کوئی مال (مثلاً: سونا، چاندی، یا مالِ تجارت) نہ ہوتو جب تک نقدی اتنی نہ ہو جائے کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے، اس وقت تک زکاۃ فرض نہیں ہوتی اور اگر نقدی اتنی ہو جائے کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے تو زکاۃ فرض ہو جاتی ہے۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، أموال الزکاۃ:، ج:۲،ص:۱۰۳، دار إحیاء التراث العربی)

۴:......اگر کسی کے پاس سونا اور چاندی ہو (چاہے جتنی بھی ہو) یا سونا اور نقدی ہو یا سونا اور مالِ تجارت ہو یا چاندی اور نقدی ہو یا چاندی اور مالِ تجارت ہو یا (تینوں مال) سونا، چاندی اور نقدی ہو یا سونا، چاندی اور مالِ تجارت ہو یا (چاروں مال) سونا، چاندی، نقدی اور مالِ تجارت ہوتو ان تمام صورتوں میں ان اموال کی قیمت لگائی جائے گی، اگر ان کی قیمت ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو زکاۃ واجب ہوگی، ورنہ نہیں۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، صفۃ الزکاۃ، ج:۲،ص:۱۰۵-۱۰۶، دار إحیاء التراث العربی)

دوسری قسم کا نصاب (زکاۃ لینے والے کے لیے)

اس نصاب میں مذکورہ نصاب (یعنی پہلی قسم کے نصاب کی تمام صورتوں) کے ساتھ ضرورت سے زائد سامان کو بھی شامل کیا جائے گا، اور نصاب کی اس دوسری قسم میں بھی وہ تمام صورتیں بنیں گی جو پہلی قسم کے نصاب میں بنتی تھیں، مثلاً:

۱:......اگر کسی کے پاس صرف ''سونا'' اور ''ضرورت سے زائد سامان'' ہوتو ان دونوں قسم کے اموال کی قیمت لگائی جائے گی، اگر ان کی قیمت اتنی ہو جائے کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے تو اس مقدار کی مالیت کے مالک کو زکاۃ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص پر صدقۂ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے۔

۲:......اگر کسی کے پاس صرف ''چاندی'' اور ''ضرورت سے زائد سامان'' ہو اور کوئی مال (سونا، نقدی یا مالِ تجارت) نہ ہوتو ان دونوں قسم کے اموال کی قیمت لگائی جائے گی، اگر ان کی قیمت اتنی ہو جائے کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے تو اس مقدار کی مالیت کے مالک کو زکاۃ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص پر صدقہ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے۔

۳:......اگر کسی کے پاس صرف ''نقدی'' اور ''ضرورت سے زائد سامان'' ہو اور کوئی مال (مثلاً:

سونا، چاندی، یا مالِ تجارت) نہ ہوتو جب ان کی قیمت اتنی ہو جائے کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے، تو اس مقدار کی مالیت کے مالک کو زکاۃ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص پر صدقہ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے۔ اور اگر ان دونوں کی قیمت اتنی نہ ہو کہ اس سے ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی خریدی جاسکے تو ایسے شخص کا زکاۃ لینا جائز ہے۔

۴:......اگر کسی کے پاس (پانچوں مال) سونا، چاندی، نقدی، مالِ تجارت اور ''ضرورت سے زائد سامان'' ہوتو ان تمام صورتوں میں ان تمام اموال کی قیمت لگائی جائے گی، اگر ان کی قیمت ساڑھے باون تولے (612.35 گرام) چاندی کی قیمت کے برابر ہو جائے تو اس مقدار کی مالیت کے مالک کا زکاۃ لینا جائز نہیں ہے اور ایسے شخص پر صدقہ فطر اور قربانی کرنا واجب ہے۔ اور اگر مذکورہ صورتوں میں سے کوئی صورت نہ ہوتو ایسا شخص شریعت کی نگاہ میں صاحب نصاب نہیں کہلاتا، یعنی اس شخص کا زکاۃ اور ہر قسم کے صدقاتِ واجبہ لینا جائز ہوگا۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، مصارف الزکاۃ، ج:۲، ص:۱۵۸، دار إحیاء التراث العربی)

ضرورت سے زائد سامان

وہ تمام چیزیں ہیں جو گھروں میں رکھی رہتی ہیں، جن کی سالہا سال ضرورت نہیں پڑتی۔

الف: وی سی آر، ڈش، ناجائز مضامین کی آڈیو ویڈیو کیسٹیں جیسی چیزیں ضروریات میں داخل نہیں، بلکہ لغویات ہیں۔ مذکورہ قسم کا سامان ضرورت سے زائد کہلاتا ہے، اس لیے ان سب کی قیمت حساب میں لگائی جائے گی۔

ب: رہائشی مکان، پہننے، اوڑھنے کے کپڑے، ضرورت کی سواری اور گھریلو ضرورت کا سامان جو عام طور پر استعمال میں رہتا ہے، یہ سب ضرورت کے سامان میں داخل ہیں، اس کی وجہ سے انسان شرعاً مالدار نہیں ہوتا، یعنی ان کی قیمت نصاب میں شامل نہیں کی جاتی۔ (الفتاویٰ الھندیہ، کتاب الزکاۃ، الباب الأول فی تفسیر الزکاۃ، ج:۱، ص:۱۷۴، رشیدیہ)

ج: صنعتی آلات، مشینیں اور دوسرے وسائل رزق (جن سے انسان اپنی روزی کماتا ہے) بھی ضرورت میں داخل ہیں، ان کی قیمت بھی نصاب میں شامل نہیں کی جاتی، مثلاً: درزی کی سلائی مشین، ترکھان، لوہار اور کاشت کار وغیرہ کے اوزار، سبزی یا پھل بیچنے والے کی ریڑھی یا سائیکل وغیرہ۔ (الفتاویٰ الھندیہ، کتاب الزکاۃ، الباب الأول فی تفسیر الزکاۃ، ج:۱، ص:۱۷۴، رشیدیہ)

د: اگر کسی کے پاس ضرورت پوری کرنے کا سامان ہے، لیکن اس نے کچھ سامان اپنی ضرورت سے زائد بھی اپنے پاس رکھا ہوا ہے، مثلاً: کسی کی ضرورت ایک گاڑی سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن اس کے پاس دو گاڑیاں ہیں، یا اس کی ضرورت ایک مکان سے پوری ہو جاتی ہے، لیکن اس نے دو مکان رکھے ہوئے ہیں تو اس زائد گاڑی اور زائد مکان کی قیمت کو نصاب میں داخل کیا

جائے گا۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، مصارف الزکاۃ، ج:۲،ص:۱۵۸، دار إحیاء التراث العربي)

زکاۃ واجب ہونے کے لیے تاریخ

زندگی میں سب سے پہلی بار جب کسی کی ملکیت میں پہلی قسم کے نصاب کے مطابق مال آجائے، تو وہ دیکھے کہ اس دن قمری سال (چاند) کی کون سی تاریخ ہے؟ اس تاریخ کو نوٹ کر لے، یہ تاریخ اس شخص کے لیے زکاۃ کے حساب کی تاریخ کے طور پر متعین ہوگئی ہے۔ واضح رہے کہ زکاۃ کے وجوب اور ادائیگی کے لیے قمری سال ہونا ضروری ہے، اگر کسی کو قمری تاریخ یاد نہ ہو تو خوب غور وفکر کر کے کوئی قمری تاریخ متعین کر لینا چاہیے، آئندہ اسی کے مطابق حساب کیا جائے گا، البتہ حساب کتاب کرنے کے بعد ادائیگی زکاۃ شمسی تاریخ سے کرنا جائز ہے۔

زکاۃ کا حساب کرنے کا طریقہ

جس چاند کی تاریخ کو کسی کے پاس بقدر نصاب مال آیا، اس سے اگلے سال ٹھیک اسی تاریخ میں اپنے مال کا حساب کیا جائے، اگر بقدر نصاب کے مال ہے تو اس کل مال کا اڑھائی فیصد (2.5%) زکاۃ دینا ہوگی۔ (العالمگیریہ، کتاب الزکاۃ، ج:۱،ص:۱۷۵، رشیدیہ)

مال پر سال گزرنے کا مطلب

جس تاریخ میں زکاۃ واجب ہوئی تھی اس کے ایک سال بعد زکاۃ دی جائے گی، اس ایک سال کے گزرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پہلی تاریخ اور ایک سال کے بعد والی تاریخ میں مال نصاب کے بقدر اس شخص کی ملکیت میں رہے، ان دونوں تاریخوں کے درمیان میں مال میں جتنی بھی کمی بیشی ہوتی رہے، اس سے کچھ اثر نہیں پڑتا، بس شرط یہ ہے کہ مال بالکلیہ ختم نہ ہوگیا ہو، یعنی مال کے ہر ہر جز پر سال کا گزرنا شرط نہیں ہے، بلکہ واجب ہونے کے بعد اگلے سال اسی تاریخ میں نصاب کا باقی رہنا ضروری ہے، اگر نصاب باقی ہوا تو ادائیگی لازم ہوگی، ورنہ نہیں۔ (بدائع الصنائع، کتاب الزکاۃ، اموال الزکاۃ، ج:۲،ص:۹۶، دار إحیاء التراث العربي)

مالِ تجارت کی زکاۃ کے احکام

''مال تجارت کی مراد'' پیچھے واضح کی جاچکی ہے۔ بعض افراد اس غلط فہمی میں رہتے ہیں کہ تجارت کا مال صرف وہ ہے جس کی انسان باقاعدہ تجارت کرتا ہو، اور نفع کمانے کی نیت سے خرید و فروخت کرتا ہو، حالانکہ شرعاً کسی چیز کے مالِ تجارت بننے کے لیے اس میں مذکورہ قید ضروری نہیں، بلکہ جو چیز بھی انسان فروخت کرنے کی نیت سے خریدے وہ تجارت کے مال میں شمار ہوتی ہے، البتہ خریدتے وقت فروخت کرنے کی نیت نہ ہو تو بعد میں فروخت کر لینے کی نیت سے وہ چیز مالِ تجارت نہیں بنے گی۔ دوسری طرف وہ چیز جسے تجارت کی نیت سے خریدا تھا، اگر بعد میں تجارت کی نیت بدل لی تو وہ چیز

مالِ تجارت سے نکل جائے گی۔ سونا، چاندی اور نقد رقم اس تعریف سے خارج ہے، یعنی ان کے لیے کسی خاص نیت وغیرہ کی ضرورت نہیں، یہ ہر حال میں مالِ زکاۃ ہیں۔ (ردالمحتار، کتاب الزکاۃ، ج:۲،ص:۲۶۷،سعید)

تجارتی اموال سے متعلق کچھ مسائل

۱:......جن اشیا کو فروخت کرنا مقصود نہ ہو، بلکہ ان کی ذات کو باقی رکھتے ہوئے ان سے کرایہ وغیرہ حاصل کرنا یا کسی اور شکل میں نفع کمانا مقصود ہو، تو وہ چیزیں مالِ تجارت میں داخل نہیں ہیں، مثلاً: کارخانوں کا منجمد اثاثہ، پرنٹنگ پریس، مشینری، پلانٹ، دکان کا فرنیچر، استعمال کی گاڑی، ٹریکٹر، ٹیوب ویل، کرائے پر چلانے کی نیت سے خریدی گئی گاڑی، رکشہ وغیرہ، کرائے پر دینے کی نیت سے بنا یا گیا مکان یا دوکان وغیرہ، گھر کے استعمال کے برتن، کرائے پر دینے کے لیے رکھے ہوئے برتن، کراکری کا سامان، فریج، فرنیچر، سلائی یا دھلائی کی مشین، ڈرائی کلینرز کے پلانٹ وغیرہ۔ اس قسم کی چیزیں چونکہ فروخت کرنے کی نیت سے نہیں خریدی گئیں، بلکہ ان کو باقی رکھ کر ان سے نفع اٹھانا مقصود ہے، اس لیے یہ مالِ تجارت میں داخل نہیں ہوں گی اور ان پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی، ہاں اگر ان کو خریدا ہی فروخت کرنے کے لیے ہو تو یہ مالِ تجارت ہوں گی۔ اسی طرح موجودہ دور میں بعض مکینک حضرات اپنے کام کاج کے اوزاروں کے ساتھ بعض اوزاروں کو اس لیے خریدتے ہیں کہ بوقتِ ضرورت گاہکوں کی مشینری وغیرہ میں فٹ کردیں گے، اور اس کی قیمت گاہکوں سے وصول کرلیں گے، تو یہ مال بھی مالِ تجارت میں داخل ہے۔ (ردالمحتار، کتاب الزکاۃ، ج:۲،ص:۲۶۷،سعید)

۲:......اگر کوئی جانور بیچنے کے لیے خریدے تو وہ بھی مالِ تجارت میں داخل ہیں، ان کی زکاۃ بھی تجارت کے اموال کی طرح واجب ہوگی۔ (احسن الفتاویٰ:، ج:۴،ص:۲۸۶)

قصاب جو جانور ذبح کر کے گوشت بیچتے ہیں تو یہ جانور بھی مالِ تجارت میں داخل ہیں۔ جو جانور دودھ حاصل کرنے کے لیے خریدے تو وہ مالِ تجارت میں داخل نہیں ہیں، البتہ ان کے دودھ سے حاصل ہونے والی کمائی نقد رقم میں داخل ہوکر نصاب کا حصہ بنے گی۔ (احسن الفتاویٰ:، ج:۴،ص:۲۸۷)

سامانِ تجارت کی قیمت لگانے کا طریقہ

''پہلی قسم کا نصاب'' اور ''دوسری قسم کا نصاب'' پہچاننے کے طریقے میں جو یہ ذکر کیا گیا کہ ''دوسری قسم کے نصاب میں ضرورت سے زائد سامان کی قیمت لگائی جائے'' تو اس قیمت سے مراد اس سامان کی قیمتِ فروخت ہے، نہ کہ قیمتِ خرید، یعنی حساب کرنے کی تاریخ میں اس سامان کی قیمت لگوائی جائے جو عام بازار میں اس کی قیمت کے برابر ہو اور عموماً اس قیمت پر وہ بک بھی جاتا ہو، اس کو نصاب میں شمار کیا جائے گا۔ اسی طرح سونا، چاندی کی بھی قیمتِ فروخت کا اعتبار ہوگا، مثلاً: کراچی میں کسی شخص نے یہ چیز دس ہزار میں خریدی، پھر فروخت کرنے کے وقت اس کی قیمت پندرہ ہزار یا کم ہو کے سات ہزار ہوگئی تو

قیمت فروخت والی قیمت کو زکاۃ کے لیے شمار کیا جائے گا۔ (ردالمحتار، کتاب الزکاۃ، باب زکاۃ الغنم: ، ج:۲، ص:۲۸۶، سعید)

قرض پر زکاۃ کا حکم

جو رقم کسی کو بطور قرض دی ہو، اس کی دو قسمیں ہیں: ایک تو وہ قرض ہے، جس کے (کبھی نہ کبھی) واپس ملنے کی امید ہو۔ دوسرا وہ قرض ہے، جس کے واپس ملنے کی امید ختم ہو چکی ہو۔

تو پہلی قسم والے قرض کی زکاۃ دی جائے گی اور دوسری قسم کے قرض کی زکاۃ نہیں دی جائے گی۔ البتہ اگر کبھی یہ قرض بھی وصول ہو گیا تو اس کی بھی زکاۃ ادا کی جائے گی۔ (ہندیہ، کتاب الزکاۃ، الباب الاول، ج:۱، ص:۱۷۴، ۱۷۵، رشیدیہ)

بینکوں کے زکاۃ کاٹنے کا حکم

حکومت کے آرڈیننس کے تحت حکومت بینکوں سے لوگوں کی رقمیں زکاۃ کی مد میں کاٹتی ہے۔ شرعاً اس طریقے سے زکاۃ کی ادائیگی نہیں ہوتی، حکومتِ وقت کے اس طرح زکاۃ کاٹنے میں شرعاً دس خرابیاں ہیں جنہیں فتاویٰ بینات جلد دوم، ص:۶۳۵ تا ۶۴۰ میں تفصیل سے ذکر کیا گیا ہے، بوقتِ ضرورت وہاں مراجعت کر لی جائے۔ (فتاویٰ بینات، کتاب الزکاۃ، حکومت کا مسلمانوں سے زکاۃ وصول کرنا، ص:۶۳۵-۶۴۰، مکتبہ بینات)

کمیٹی کی رقم پر زکاۃ کا حکم

کچھ افراد مل کے کمیٹی ڈالتے ہیں، کچھ ممبروں کی کمیٹی پہلے نکل آتی ہے، مثلاً: بیس افراد نے مل ایک ایک ہزار روپے جمع کر کے کمیٹی ڈالی، ان میں سے ایک کی کمیٹی پہلے نکل آئی، اب اس شخص کے پاس انیس ہزار روپے دوسروں کے ہیں اور ایک ہزار اپنا، تو یہ شخص اگر صاحب نصاب ہے تو یہ اپنے ایک ہزار روپے کو اس نصاب میں داخل کرے گا، انیس ہزار کو نہیں، اسی طرح ہر ممبر صرف اتنی رقم نصابِ زکاۃ میں جمع کرے گا، جتنی اس نے ابھی تک جمع کروائی تھی، البتہ آخری شخص پورے بیس ہزار کو اپنے نصاب میں شامل کرے گا، اور اگر یہ مذکورہ افراد صاحبِ نصاب نہیں ہوں تو اس نکلنے والی کمیٹی کی رقم پر زکاۃ واجب نہیں ہوگی۔ (الفتاویٰ الھندیہ، کتاب الزکاۃ، الباب الأول فی تفسیر الزکاۃ، ج:۱، ص:۱۷۳، رشیدیہ)

خلاصہ کلام

آخر میں بطورِ خلاصہ ان تمام اثاثوں کا ذکر کیا جاتا ہے، جن پر زکاۃ واجب ہوتی ہے اور جن پر واجب نہیں ہوتی۔ وہ اثاثے جن پر زکاۃ واجب ہوتی ہے، وہ یہ ہیں:

۱:...... سونے کی مارکیٹ ویلیو (خواہ سونا زیور کی صورت میں ہو، یا کسی بھی شکل میں ہو)۔ ۲:...... چاندی کی مارکیٹ ویلیو (خواہ چاندی زیور کی صورت میں ہو یا کسی بھی شکل میں ہو)۔ ۳:...... نقد رقم۔ ۴:...... کسی کے پاس رکھی گئی امانت (خواہ رقم ہو یا سونا، چاندی)۔ ۵:...... بینک بیلنس۔ ۶:...... غیر ملکی

کرنسی کی مارکیٹ ویلیو۔ ۷:......کسی بھی مقصد (مثلاً: حج، بچوں کی شادی یا مکان وغیرہ کی خریدنے) کے لیے رکھی ہوئی رقم۔ ۸:......حج کے لیے جمع کروائی ہوئی وہ رقم جو معلم کی فیس اور کرایہ جات وغیرہ کاٹ کر واپس کر دی جاتی ہے۔ ۹:...... بچت سرٹیفکیٹ مثلاً: FEBC،NDFC،NIT کی اصل رقم (اگرچہ ان کا خریدنا ناجائز ہے)۔ ۱۰:...... پرائز بانڈز کی اصل قیمت (اگرچہ ان کی خرید وفروخت اور ان پر ملنے والا انعام جائز نہیں ہے)۔ ۱۱:...... انشورنس پالیسی میں جمع کردہ اصل رقم (اگرچہ مروجہ انشورنس کی تمام صورتیں ناجائز ہیں)۔ ۱۲:......قرض دی ہوئی رقم (بشرطیکہ واپس ملنے کی امید ہو)۔ ۱۳:......کسی بھی مقصد کے لیے دی ہوئی ایڈوانس رقم، جس کا اصل یا بدل اسے واپس ملے گا۔ ۱۴:......سیکورٹی ڈیپازٹ کے طور پر جمع کردہ رقم۔ ۱۵:...... بی سی (کمیٹی) میں جمع کروائی ہوئی رقم (بشرطیکہ ابھی تک کمیٹی نکلی نہ ہو)۔ ۱۶:......تجارتی یا تجارت کی نیت سے خریدے گئے حصص۔ ۱۷:......شرکت والے معاملے میں اپنے حصے کے قابل زکاۃ اثاثوں کی رقم بمع نفع۔ ۱۸:...... بیچنے کے لیے خریدا ہوا سامان، جائیداد، حصص اور خام مال۔ ۱۹:......تجارت کے لیے خریدی ہوئی پراپرٹی۔ ۲۰:...... ہر قسم کے تجارتی مال کی مارکیٹ ویلیو (یعنی: قیمتِ فروخت)۔ ۲۱:......فروخت شدہ چیزوں کی قابلِ وصول رقم۔ ۲۲:......تیار مال کا اسٹاک۔ ۲۳:......خام مال۔

جو رقم مالِ زکاۃ سے منہا کی جائے گی

۱:......ادھار لی ہوئی رقم۔ ۲:......خریدی ہوئی چیز کی واجب الاداء قیمت۔ ۳:......کمیٹی حاصل کرنے کے بعد بقیہ اقساط کی رقم۔ ۴:...... ملازمین کی تنخواہ، جس کی ادائیگی اس تاریخ تک لازم ہو چکی ہے۔ ۵:...... یوٹیلٹی بلز، کرایہ وغیرہ جن کی ادائیگی اس تاریخ تک لازم ہو چکی ہو۔ ۶:......گزشتہ سالوں کی زکاۃ اگر ابھی تک ادا نہ کی گئی ہو۔ ۷:......قسطوں پر خریدی ہوئی چیز کی واجب الاداء قسطیں۔

اب ماقبل میں ذکر کیے گئے ''وہ اثاثے جن پر زکاۃ واجب ہوتی ہے'' کی تمام صورتوں کو سامنے رکھتے ہوئے اپنی کل قیمت جمع کر لیں، پھر ''جو رقم مالِ زکاۃ سے منہا کی جائے گی'' میں ذکر کی گئی صورتوں کے ہونے کی صورت میں تمام چیزوں کی قیمت جمع کر کے پہلی رقم میں سے نفی کر لیں، اب جو رقم باقی بچے، اس کا چالیسواں حصہ (یعنی: ڈھائی فی صد) بطورِ زکاۃ نکال کر مستحقین تک پہنچائیں۔

ناقابلِ زکاۃ اثاثے

۱:...... رہائشی مکان، ایک ہو یا زیادہ۔ ۲:...... دکان، البتہ دکان کا مال مالِ زکاۃ ہوتا ہے۔ ۳:......فیکٹری کی زمین، بشرطیکہ فروخت کی نیت سے نہ لی گئی ہو۔ ۴:...... دکان، گھر، فیکٹری کا فرنیچر۔ ۵:...... زرعی زمین، بشرطیکہ فروخت کی نیت نہ ہو۔ ۶:...... کرایہ پر دیا ہوا مکان، دکان یا فلیٹ۔ ۷:...... مکان، دکان، اسکول یا فیکٹری بنانے کے لیے خریدا ہوا پلاٹ۔ ۸:...... کرایہ پر چلانے کے لیے ٹرانسپورٹ گاڑی، مثلاً: ٹیکسی، رکشہ یا بس وغیرہ۔ مذکورہ اشیاء پر زکاۃ واجب نہیں ہوتی۔

www.banuri.edu.pk

قرآن مجید کے حقوق اور ہمارا طرزِ عمل

مولانا سید عبدالوہاب شیرازی

ہدایت کے دو پہلو

ہدایت کا ایک پہلو نظری، فکری اور علمی ہدایت ہے، جبکہ ہدایت کا دوسرا پہلو عملی، اخلاقی اور زندگی کے معمولات کے ضمن میں ہدایت ہے، یعنی انسان میں حق و باطل کی تمیز پیدا ہو جانا۔

پہلا پہلو

جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقت نہیں، بلکہ جو کچھ اس کے پیچھے ہے وہ حقیقت ہے۔ کائنات میں جو کچھ نظر آ رہا ہے یہ حقیقت نہیں، بلکہ حقیقت اس کے پیچھے ہے۔ ایک ہمارا یہ ظاہری وجود ہے، جس میں درد محسوس ہوتا ہے، لیکن یہ حقیقت نہیں، حقیقی وجود روحانی وجود ہے جو نظر نہیں آتا۔

اسی طرح یہ کارخانۂ دنیا ہے، یہاں کی رنگینیاں ہیں، ساز و سامان ہے، لیکن حقیقت اس کے پیچھے ہے یعنی آخرت۔ یہ جو ظواہر ہیں ان کی بجائے حقائق پر توجہ ہو تو یہ نظری ہدایت ہے، یعنی ظاہر و باطن اور حق و باطل کا فرق معلوم ہو جانا یہ ہدایت ہے۔ تین حقائق یعنی ذات باری تعالیٰ، روح انسانی اور حیات اخروی پر جب تین ظواہر یعنی کائنات، جسم انسانی اور حیات دنیوی کا پردہ پڑ جائے تو یہی دجل اور دجالیت ہے۔ حضور ﷺ کی ایک بہت ہی پیاری دعا اسی بارے میں ہے:

''أَللّٰھم أَرِنِیْ حَقِیْقَۃَ الْأَشْیَاءِ کَمَاھِیَ''۔

''اے اللہ! مجھے تمام چیزوں کی حقیقت اسی طرح دکھا دے جس طرح وہ ہیں''۔

دوسرا پہلو

دوسری ہدایت عملی ہے اور اس کے بھی دو درجے ہیں: ۱:...... انفرادی سطح پر ہدایت۔ ۲:...... اجتماعی سطح پر ہدایت۔

انفرادی ہدایت یہ ہے کہ: انسان کو یہ سمجھ آ جائے کہ مَیں کیا کروں، کیا نہ کروں؟ کیا خیر ہے اور کیا شر ہے؟ کیا اچھی بات ہے اور کیا بری بات ہے؟ یہ انفرادی ہدایت اللہ نے ہر انسان کے دل میں

ودیعت کی ہے، جیسا کہ ارشادِ باری ہے:

''وَنَفْسٍ وَّمَا سَوَّاهَا، فَأَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوَاهَا'' ۔ (الشمس: ۷، ۸)

یہی وجہ ہے اس انفرادی معاملے پر قرآن مجید میں اتنا زیادہ زور نہیں دیا گیا، ان باتوں کو معروف اور منکر کہا گیا ہے، معروف یعنی جانی پہچانی جس سے خود ہی انسان واقف ہے، اور منکر یعنی جس سے خود ہی انسانی نفس نفرت کرتا ہے، دنیا کے کس انسان کو معلوم نہیں کہ سچ بولنا اچھی اور جھوٹ بولنا بری بات ہے۔

اجتماعی سطح پر ہدایت

انسان کی اصل احتیاج اجتماعی زندگی کی ہدایت ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں آ کر انسان افراط وتفریط کا شکار ہو جاتا ہے۔ دنیا میں تین بڑے اجتماعی مسائل ہیں:

۱:...... مرد وعورت کے حقوق میں توازن۔

۲:...... ریاست اور شہری کے حقوق میں توازن، یعنی شہری کو کتنی آزادی ہے اور کتنا پابند ہے اور ریاست کو کتنی آزادی ہے اور کتنی پابند ہے۔

۳:...... سرمایہ اور محنت، سرمایہ دار اور مزدور کے حقوق کا توازن۔ یہاں آ کر انسان ہدایت کا محتاج ہو جاتا ہے اور وہ ہدایت قرآن مجید سے ملتی ہے:

''اَلرَّحْمٰنُ، عَلَّمَ الْقُرْاٰنَ، خَلَقَ الْاِنْسَانَ، عَلَّمَهُ الْبَيَانَ'' ۔ (الرحمٰن: ۱، ۲، ۳، ۴)

رحمٰن اللہ کے ناموں میں سے چوٹی کا نام ہے اور قرآن تمام کتابوں میں سے چوٹی کی کتاب ہے اور انسان تمام مخلوقات میں سے چوٹی کی مخلوق ہے اور بیان انسان کی تمام صلاحیتوں میں سے چوٹی کی صلاحیت ہے۔

ان آیات میں ہمیں یہ تعلیم دی گئی کہ رحمٰن کی چوٹی کی مخلوق انسان کو چاہیے کہ وہ اپنی چوٹی کی صلاحیت یعنی بیان کو اللہ کی چوٹی کی کتاب قرآن کو بیان کرنے پر صرف کرے۔ اس ساری گفتگو کا نتیجہ یہ ہے کہ پوری قوت کے ساتھ انفرادی اور اجتماعی سطح پر رجوع الی القرآن کی زبردست تحریک چلنی چاہیے، تاکہ سب مسلمان قرآن کے ساتھ جڑ جائیں، قرآن کو سیکھیں اور سکھائیں، سمجھیں اور سمجھائیں، عمل کریں اور عمل کروائیں، اسی سے ہمارے سارے مسائل حل ہو جائیں گے۔

آج قرآن ہماری زندگیوں سے نکل گیا ہے، ہم اگرچہ کئی کام انفرادی سطح کے کرتے ہیں، لیکن اجتماعی سطح پر پہلا قدم رکھتے ہی پیچھے ہٹ جاتے ہیں۔ ہم رواجی پردہ تو کرتے ہیں، لیکن شرعی پردہ نہیں کرتے، رواجی پردہ یہ ہے کہ اجنبی سے پردہ کرو اور جاننے والے یا رشتہ دار سے نہیں، جبکہ شرعی پردہ یہ ہے کہ غیر محرم سے پردہ کرو، چاہے وہ رشتہ دار یا جاننے والا ہی کیوں نہ ہو۔ اسی طرح دیگر اجتماعی مسائل میں ہماری یہی حالت ہے کہ ہم دین پر عمل نہیں کرتے۔

قرآن مجید کے پانچ حقوق

آج دنیا میں حقوق کی جنگیں لڑی جارہی ہیں، کہیں خواتین کے حقوق کی بات ہورہی ہے اور کہیں جانوروں کے حقوق کی، لیکن آج کے مسلمان کو یہ نہیں معلوم کہ اس پر قرآن مجید کے کتنے حقوق ہیں۔ جاننا چاہیے کہ ہر مسلمان پر قرآن مجید کے پانچ حقوق ہیں:

۱:......ایمان وتعظیم۔ ۲:......تلاوت وترتیل۔
۳:......تذکر وتدبر۔ ۴:......حکم واقامت۔
۵:......تبلیغ وتبیین

پہلا حق:......ایمان وتعظیم

ایمان کے دو حصے ہیں: ایک اقرار اور دوسرا تصدیق۔ ہم اقرار تو کرتے ہیں، لیکن یقین اور تصدیق کی ہمارے اندر کمی ہے، لہٰذا ہماری ذمہ داری ہے کہ ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں کہ آیا ہم قرآن کو متوارث مذہبی عقیدے کی بنا پر ایک آسمانی مقدس کتاب سمجھتے ہیں، جس کا زندگی اور اس کے جملہ معاملات سے تعلق نہ ہو یا یہ یقین ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے جو اس لیے نازل ہوا کہ لوگ اس سے ہدایت حاصل کریں اور اسے اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنائیں؟۔

ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ کمی کیسے پوری ہو؟ اس کا جواب یہ ہے کہ ایمان ویقین کے حصول کا سب سے آسان ذریعہ اصحاب ایمان ویقین کی صحبت ہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا عظیم ایمان بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت کا نتیجہ تھا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد ہمارے لیے بھی اصحاب یقین کی صحبت ضروری ہے اور خود ایسے خواص کے لیے نور ایمان کا منبع قرآن ہے، پھر اس کے بعد سیرت رسول واصحاب رسول کا مطالعہ کرنے سے معنوی صحبت میسر آجاتی ہے۔

ایمان کوئی ٹھوس چیز نہیں جسے باہر سے ٹھونس کر اندر داخل کیا جائے، بلکہ ایمان کی چنگاری ہر انسان کے اندر موجود ہوتی ہے، لیکن اعمالِ بد نے اُسے دھندلا کیا ہوتا ہے، اس چنگاری کو شعلہ بنانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''إِنَّ هٰذِهِ الْقُلُوْبَ تَصْدَأُ كَمَا يَصْدَأُ الْحَدِيْدُ إِذَا أَصَابَهُ الْمَاءُ، قِيْلَ يَارَسُوْلَ اللّٰهِ! مَا جِلَاءُ هَا؟ قَالَ كَثْرَةُ ذِكْرِ الْمَوْتِ وَتِلَاوَةُ الْقُرْآنِ''۔ (رواہ البیہقی)

''بے شک دلوں کو بھی زنگ لگ جاتا ہے، جس طرح لوہے کو پانی لگنے سے زنگ لگ جاتا ہے، عرض کیا گیا: اللہ کے رسول! اس کی صفائی کس طرح ہوگی؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہر وقت موت کا دھیان رکھنا اور قرآن کریم کی کثرت سے تلاوت کرنا''۔

دوسرا حق :......تلاوت

قرآن مجید کا دوسرا حق اس کی قراءت اور تلاوت ہے۔ قراءت کا لفظ ہر کتاب کے لیے بولا جاتا ہے، جبکہ تلاوت کا لفظ صرف قرآن کے لیے خاص ہے۔ پہلے زمانے میں قاریِ قرآن کو عالم کہا جاتا تھا، لیکن پھر آہستہ آہستہ یہ لفظ ان لوگوں کے لیے استعمال ہونے لگا جو قرآن کو مخارج اور صفات کا لحاظ رکھتے ہوئے اہتمام کے ساتھ پڑھتے ہیں۔

قرآن کریم کی تلاوت بار بار کرنے کی ضرورت ہے، جس طرح جسم انسانی بار بار کھانے کا محتاج ہوتا ہے، اسی طرح روح انسانی بھی غذا کی محتاج ہے اور روح کی سب سے عمدہ غذا تلاوت قرآن کریم ہے۔ پھر اس تلاوت کے بھی کچھ حقوق ہیں:

☆ تلاوت کا پہلا حق یہ ہے کہ قرآن کریم کو تجوید کے قواعد کا لحاظ کر کے تلاوت کیا جائے، یعنی مخارج، صفات اور رموز واوقاف کا علم ہونا چاہیے، تاکہ قرآن کریم کی تلاوت کا حق ادا ہو سکے۔

☆ تلاوت کا دوسرا حق یہ ہے کہ روزانہ کا معمول ہونا چاہیے۔ زیادہ سے زیادہ تلاوت کا نصاب دس پارے روزانہ ہے اور کم سے کم نصاب ایک پارہ روزانہ ہے۔ ان دونوں کے درمیان ایک نصاب ہے، جس پر اکثر صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کا معمول تھا، وہ ایک ہفتے میں ختم قرآن کا ہے۔ قرآن مجید میں سات منزلوں کی تقسیم اسی وجہ سے ہے کہ ایک منزل روزانہ تلاوت کر لی جائے اور ایک منزل کو تلاوت کرنے میں تقریباً دو گھنٹے صَرف ہوتے ہیں۔

☆ تلاوت کا تیسرا حق خوش الحانی ہے، فرمایا:

''زَيِّنُوا الْقُرْأٰنَ بِأَصْوَاتِكُمْ''۔ (سنن ابی داؤد، ج:۱، ص:۵۴۸، دارالکتاب العربی، بیروت)

ترجمہ: ''قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کر کے پڑھو''۔

اور ایک روایت میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے تنبیہ فرمائی کہ:

''لَيْسَ مِنَّامَنْ لَّمْ يَتَغَنَّ بِالْقُرْأٰنِ ''۔ (سنن ابی داؤد، ج:۱، ص:۵۴۸، دارالکتاب العربی، بیروت)

ترجمہ: ''جو قرآن کو خوبصورت نہیں پڑھتا، وہ ہم میں سے نہیں ہے''۔

☆ تلاوت کا چوتھا حق یہ ہے کہ آدابِ ظاہری و باطنی کا خیال رکھا جائے، یعنی باوضو ہو کر قبلہ رخ بیٹھ کر تعوذ وتسمیہ پڑھ کر حضوریِ قلب، اور مسلسل تذکر وتدبر اور تفہم وتفکر کر کے تلاوت کا اہتمام کیا جائے۔ اپنے خود ساختہ خیالات ونظریات کی سند قرآن میں نہ ڈھونڈی جائے، بلکہ قرآن سے ہدایت لینے کے لیے اُسے پڑھا جائے۔

☆ تلاوت کا پانچواں حق ترتیل ہے، یعنی تلاوت ٹھہر ٹھہر کر کی جائے، اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ''وَرَتِّلِ الْقُرْآنَ تَرْتِيْلاً ''۔ ''اور قرآن کو ٹھہر ٹھہر کر پڑھو''۔ ٹھہر ٹھہر کر پڑھنا تثبیتِ قلبی کا

ذریعہ بھی ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے فرمایا:

''وَکَذَالِکَ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَکَ وَرَتَّلْنٰهُ تَرْتِيْلاً''۔ (الفرقان:۳۲)

ترجمہ: ''اور اسی طرح (اتارا) تاکہ ہم اس کے ذریعے تمہارے دل کو ثبات عطا کریں، چنانچہ پڑھ سنایا ہم نے اس کو ٹھہر ٹھہر کر''۔

چنانچہ ترتیل کے ساتھ پڑھنے سے زیادہ فیض حاصل ہوتا ہے۔ ایک روایت میں فرمایا: ''قرآن کی تلاوت کرو اور روؤ''۔

☆ تلاوتِ قرآن کا چھٹا حق یہ ہے کہ اس کو حفظ بھی کیا جائے۔ حفظ میں یہ ضروری نہیں کہ پورا ہی حفظ کیا جائے، بلکہ حسب توفیق زیادہ سے زیادہ حفظ کیا جائے۔

تیسرا حق:......تذکر وتدبر

یعنی قرآن کو سمجھنا۔ بغیر سمجھے قرآن کی تلاوت کا جواز ان لوگوں کے لیے ہے جو پڑھنے لکھنے سے محروم رہ گئے ہیں اور اب ان کی عمر اس حد کو پہنچ چکی ہے کہ ان کے لیے سیکھنا ناممکن ہو چکا ہے، ایسے لوگ اگر ٹوٹی پھوٹی تلاوت کریں یا تلاوت نہ کرسکیں محض عقیدت کی بنا پر سطروں پر اپنی انگلیاں ہی پھیریں تو بھی ان کو ثواب ملے گا۔ لیکن پڑھے لکھے لوگ جنہوں نے دنیا کے مختلف علوم وفنون حاصل کرنے میں زندگیاں صرف کیں، اپنی تو کیا غیر ملکی زبانیں بھی سیکھیں، ایسے لوگوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ قرآن کا فہم حاصل کریں۔

فہم کے مدارج

فہم قرآن کے دو درجے ہیں: ۱:......تذکر بالقرآن۔ ۲:......تدبر فی القرآن۔

۱:......تذکر بالقرآن یہ ہے کہ قرآن سے نصیحت حاصل کرنا، اس اعتبار سے قرآن مجید بہت ہی آسان کتاب ہے، ارشادِ ربانی ہے:

''وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّکْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّکِرٍ''۔ (القمر:۱۷)

''ہم نے قرآن کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان بنایا ہے، ہے کوئی نصیحت حاصل کرنے والا؟''۔

قرآن کو نازل کرکے اللہ تعالیٰ نے ہر انسان پر حجت قائم کردی ہے، خواہ وہ کتنی ہی کم استعداد کا مالک ہو، اگر یہ بات درست ہے تو پھر یہ بھی درست ہے کہ قرآن سے نصیحت حاصل کرنا ہر انسان کے لیے آسان ہے، ہر انسان قرآن سے تذکر حاصل کرسکتا ہے۔

۲:......تدبر فی القرآن یہ ہے کہ قرآن میں غور وخوض کیا جائے، قرآن مجید وہ سمندر ہے جس کی گہرائی کا کسی کو اندازہ نہیں ہوسکا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تدبر وتفکر میں کئی کئی سال لگاتے تھے۔ وہی

عبد اللہ بن عمر رضی اللہ عنہ جن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سات دن میں قرآن کریم ختم کرنے کا حکم فرمایا تھا، وہ صرف سورۂ بقرہ میں تدبر پر آٹھ سال لگا دیتے ہیں، حالانکہ آیات کا شانِ نزول، عربی زبان اور دیگر قواعد سب جانتے تھے، ان کو سیکھنے کی کوئی حاجت ہی نہیں تھی۔

امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک عارف کے بارے میں لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ: میں قرآن مجید کا ایک ختم ہر جمعہ کو کرتا ہوں اور ایک ختم ہر مہینے کرتا ہوں اور ایک ختم ہر سال کرتا ہوں اور ایک ختم ایسا بھی ہے جس میں تیس سال ہو گئے ہیں، ابھی جاری ہے۔

قرآن مجید کو بطریق تدبر پڑھنے کی کچھ شرائط ہیں، اس کام کے لیے اولاً عربی زبان کے قواعد کا گہرا اور پختہ علم ضروری ہے، پھر اس کے ادب کا ایک ستھرا ذوق اور فصاحت و بلاغت کا عمیق فہم لازمی ہے، اس پر مستزاد یہ کہ جس زبان میں قرآن نازل ہوا، اس کا صحیح فہم اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ادب جاہلی کا تحقیقی مطالعہ کیا جائے اور دور جاہلی کے شعرا اور خطبا کا کلام بھی پڑھا جائے، پھر اسی پر بس نہیں، قرآن کی اپنی بھی وضع کردہ اصطلاحات ہیں، جن سے واقفیت ایک طویل مدت تک قرآن کو پڑھتے رہنے سے حاصل ہوتی ہے۔ پھر قرآن کے نظم کو سمجھنا، اس کی ترتیب نزولی اور آیتوں وسورتوں کا باہمی ربط جاننا، یہ سب چیزیں بہت ضروری ہیں۔ یہ ساری وہ چیزیں ہیں جن کے بارے میں مفسرین نے چودہ علوم کا جاننا کہا ہے، اور یہ چودہ علوم والی بات تو پرانی ہے، اب تو اور کئی علوم بھی متعارف ہو گئے ہیں، اب تو سولہ یا اٹھارہ علوم کی قید لگائی جاسکتی ہے۔

چوتھا حق: ......حکم، اقامت اور عمل

قرآن مجید کا چوتھا حق یہ ہے کہ اس پر عمل کیا جائے۔ قرآن مجید نہ تو جادو منتر کی کتاب ہے کہ محض اس کا پڑھنا دفع بلیات کے لیے کافی ہے اور نہ ہی یہ محض حصول برکت اور ثواب کی کتاب ہے کہ دکان و مکان میں برکت یا مردے بخشوانے کے لیے اس کی تلاوت کی جائے، بلکہ یہ ''هُدًى لِّلنَّاسِ'' ہے، اس کا مقصدِ نزول اس ہدایت کو حاصل کرنا ہے اور اُسے اپنی زندگیوں کا لائحہ عمل بنانا ہے۔

ایک شخص تو وہ ہے جو تلاشِ حق میں لگا ہوا ہے، اس کو قرآن کے حق ہونے یا نہ ہونے کا یقین نہیں ہے، لیکن وہ لوگ جو اسے حق سمجھتے ہیں، اس پر ایمان رکھتے ہیں، ان کے لیے تو ضروری ہے کہ وہ قرآن کریم کو اپنی زندگی پر عملاً نافذ کریں، وہ قرآن کریم کی انگلی پکڑ کر چلنے کی کوشش کریں۔

عمل کے دو پہلو

پھر اس عمل کے بھی دو پہلو ہیں: ایک انفرادی اور دوسرا اجتماعی، ایسے احکام جن کا تعلق انفرادی زندگی سے ہے، ان کا تو انسان فی الفور مکلّف ہے، البتہ ایسے احکام جن کا تعلق اجتماعی زندگی سے ہے ان کا فی الفور مکلّف تو نہیں، لیکن ان کو درست کرنے کی کوشش کرنا یہ ضروری ہے۔

پانچواں حق: ......تبلیغ وتبیین

قرآن مجید کا پانچواں حق اُسے دوسروں تک پہنچانا ہے، جیسا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

’’بَلِّغُوْا عَنِّي وَلَوْ اٰيَةً‘‘۔ (سنن الترمذی، ج:۴،ص:۳۳۷، ط: دار الغرب الاسلامی، بیروت)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ تبلیغ کی ذمہ داری سے کوئی بھی بری نہیں، اگرچہ ایک ہی آیت آتی ہو۔ اصلاً تو یہ فریضہ ہے کہ قرآن کریم کے الفاظ اور مفہوم کو اقوامِ عالم تک پہنچایا جائے، لیکن بدقسمتی سے جس جس کی یہ ذمہ داری تھی وہ خود محتاج ہے کہ اس تک پہنچایا جائے، اس لیے ضرورت اس بات کی ہے کہ تعلیم وتعلم قرآن کی ایک ایسی رَو چل پڑے کہ تمام مسلمان قرآن کریم کو سیکھنے سکھانے میں لگ جائیں۔

قرآن مجید کے یہ پانچ حقوق ہیں، لیکن عام طور پر جو حقوق سمجھے جاتے ہیں، وہ یہ ہیں: ریشمی جزدان میں رکھا جائے۔ جہیز میں دیا جائے۔ نزع کے وقت سرہانے کے قریب یا نئی دکان ومکان میں اس کی تلاوت کی جائے۔ عدالتوں میں قسم اٹھاتے وقت سر پر رکھا جائے۔ پریشانی کے وقت فال نکالا جائے۔ نعوذباللّٰہ من ذٰلک۔

قرآن کے ساتھ ہمارا طرزِ عمل

حضرت عبیدہ ملیکی رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

’’یا أهل القرآن ! لا تتوسدوا القرأٰن واتلوه حق تلاوته من أنٰاء الليل والنهار وافشوه وتغنوه وتدبروا فيه لعلكم تفلحون‘‘۔ (رواہ البیہقی)

ترجمہ: ’’اے اہل قرآن! اس قرآن کو پس پشت نہ ڈالو، اور اس کی تلاوت کرو جیسا اس کا حق ہے صبح اور شام، اور اس کو پھیلاؤ، اور اسے خوبصورت آوازوں سے پڑھو، اور اس میں تدبر کرو تاکہ تم فلاح پاؤ‘‘۔

لا تتوسدوا یعنی پس پشت نہ ڈالو، سہارا نہ بناؤ۔ ہم نے برکت کی کتاب سمجھ کر طاق میں رکھ دیا، اپنی قسموں کے لیے تختۂ مشق بنادیا، مرتے ہوئے شخص کے پاس سورۂ یٰسین پڑھ لیتے ہیں، بیٹی کو ٹی وی کے ساتھ جہیز میں قرآن بھی دے دیتے ہیں۔ ہمارے حال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ فرمان صادق آتا ہے:

’’إن اللّٰه يرفع بهذا الكتاب أقواما ويضع به آخرين‘‘۔ (صحیح مسلم)

ترجمہ: ’’بلاشبہ اللہ تعالیٰ اس کتاب (قرآن) کے ذریعہ بہت سی قوموں کو بلند کرتا ہے اور اس کے ذریعہ بہت سوں کو گراتا ہے‘‘۔

یعنی دنیا میں بحیثیت قوم ہماری تقدیر اس کتاب سے جڑی ہوئی ہے۔ خطبۂ حجۃ الوداع میں

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

’’وقدترکت فیکم ما لن تضلوا بعدهٗ إن اعتصمتم به : کتاب اللّٰه ‘‘۔(صحیح مسلم)

ترجمہ: ’’میں تمہارے درمیان وہ چیز چھوڑ کر جارہا ہوں کہ جب تک اس کے ساتھ چمٹے رہو گے ہرگز گمراہ نہ ہوگے اور وہ اللہ کی کتاب (قرآن) ہے‘‘۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ سے ایک طویل حدیث مروی ہے:

’’عن علی رضی اللہ عنہ قال: إنی سمعت رسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم یقول: إِنَّهَا سَتَكُونُ فِتْنَةٌ، قُلتُ: مَاالمخرجُ یارسول اللّٰه صلی اللہ علیہ وسلم ؟ قال: کتاب اللّٰه، فیه نَبَأُ مَاقَبلَکم وخَبَرُ مَابَعدَکم وحُکمُ مَابَینکُم، هوالفَصلُ لیسَ بالهَزْلِ، مَن تَرَکَهٗ مِن جَبَّارٍ قَصَمَهُ اللّٰهُ ومَنِ ابْتَغٰی الهُدٰی فِی غَیرِہ أَضَلَّهُ اللّٰهُ وهو حَبلُ اللّٰهِ المَتِینُ، وهو الذکرُ الحکیم، وهوالصراط المستقیمُ ‘‘۔ (سنن الترمذی، ج:۵،ص:۱۷۲، ط: دار إحیاء التراث العربی، بیروت)

’’حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں: میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب فتنہ ظاہر ہوگا، میں نے پوچھا اس سے نکلنے کا راستہ کیا ہے؟ (اگر آج کا مسلمان ہوتا تو فوراً پوچھتا کب ہوگا؟ کہاں ہوگا؟ کیا ہوگا؟ لیکن صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اپنی ایسی فکر لگی ہوتی تھی کہ فوراً اس سے خلاصی کا طریقہ پوچھا) آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اس سے خلاصی اللہ کی کتاب قرآن ہے، اس میں تم سے پہلے اور بعد کی خبریں ہیں اور اس میں تمہارے درمیان فیصلے ہیں، وہ قول فیصل ہے، فضول بات نہیں ہے، جو جابر سرکش اس کو چھوڑے گا اللہ اس کو توڑ کر رکھ دے گا، اور جو اس کے علاوہ ہدایت تلاش کرے گا اللہ اس کو گمراہ کردے گا، قرآن ہی حبل اللہ ہے، اور محکم نصیحت نامہ ہے، اور صراطِ مستقیم ہے‘‘۔

قرآن حبل اللہ ہے

سورۂ حج میں فرمایا: ’’وَاعْتَصِمُوْا بِاللّٰهِ ‘‘۔ لیکن بات واضح نہیں تھی، پھر اس کی شرح سورۂ آل عمران میں بیان فرمائی: ’’وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ ‘‘ اب بھی بات واضح نہیں تھی تو احادیث میں اس کی تشریح فرمائی:

۱:......ترمذی شریف کی حدیث میں ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن پاک کے فضائل بیان کرتے ہوئے فرمایا: ’’هو حبل اللّٰه المتین ‘‘۔ یہی قرآن اللہ کی مضبوط رسی ہے۔ ایک حدیث میں مزید وضاحت ہے، ایک مرتبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے حجرے سے باہر تشریف لائے، دیکھا صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن کا مذاکرہ کررہے تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

۲:......’’ألیس تشهدون أن لا إله إلااللّٰه وحده لا شریک له وأنی رسول اللّٰه وأن

القرآن جاء من عندالله؟ قلنا بلٰى. قال فأبشروا فإن هذا القرآن طرفه بيدالله وطرفه بأيديكم فتمسكوا به فإنكم لن تهلكوا ولن تضلوا بعدهٗ أبداً''۔(طبرانی کبیر)

ترجمہ:''کیاتم اس بات کی گواہی نہیں دیتے کہ اللہ کے علاوہ کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں اور قرآن اللہ کی کتاب ہے؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے فرمایا: کیوں نہیں؟! تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: خوشخبری حاصل کرو، یہ قرآن اس کی ایک طرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور دوسری طرف تمہارے ہاتھ میں ہے، لہٰذا اس کو مضبوطی سے تھام لو، اس کے بعد ہرگز گمراہ نہ ہو گے''۔

اسی طرح مصنف ابن ابی شیبہ کی ایک روایت میں ہے:

''**قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم : كتاب الله هو حبل الله الممدود من السماء إلى الأرض**''۔

ترجمہ:''اللہ کی کتاب ہی اللہ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک پہنچی ہوئی ہے''۔

اکابرینِ امت کی نظر میں تمام مسائل کا حل قرآن مجید میں

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ

اگر ایک شخص مسلمانوں کی تمام موجودہ تباہ حالیوں اور بدبختیوں کی علت حقیقی دریافت کرنا چاہے اور ساتھ ہی یہ شرط بھی لگا دے کہ صرف ایک ہی علت اصلی ایسی بیان کی جائے جو تمام علل واسباب پر حاوی اور جامع ہو تو اس کو بتایا جاسکتا ہے کہ علماء حق ومرشدین صادقین کا فقدان اور علماء سوء ومفسدین دجالین کی کثرت:

''رَبَّنَا إِنَّا أَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُبَرَاءَ نَا فَأَضَلُّوْنَاالسَّبِيْلَا''۔

اور پھر اگر وہ پوچھے کہ ایک ہی جملہ میں اس کا علاج کیا ہے؟ تو اس کو امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کے الفاظ میں جواب ملنا چاہیے کہ:

''لَايَصْلُحُ آخِرُ هٰذِهِ الْأُمَّةِ اِلَّا بِمَا صَلَحَ بِهٖ أَوَّلُهَا''۔

یعنی امت مرحومہ کے آخری عہد کی اصلاح کبھی نہ ہوسکے گی تاوقتیکہ وہی طریق اختیار نہ کیا جائے جس سے اس کے ابتدائی عہد نے اصلاح پائی تھی، اور وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن حکیم کے اصلی وحقیقی معارف کی تبلیغ کرنے والے مرشدین صادقین پیدا کیے جائیں۔ (البلاغ، جلد اول، شمارہ اول، مورخہ بارہ نومبر ۱۹۱۵ء)

حضرت مولانا انورشاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ

مفتی محمد شفیع مرحوم ومغفور فرماتے ہیں کہ:''میں حضرت مولانا سید محمد انورشاہ کاشمیری رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں ایک دن نماز فجر کے وقت اندھیرے میں حاضر ہوا تو دیکھا کہ حضرت سر پکڑے

ہوئے بہت غمزدہ بیٹھے ہیں۔ میں نے پوچھا: ''مزاج کیسا ہے؟'' انہوں نے کہا کہ: ہاں! ٹھیک ہے، میاں! مزاج کیا پوچھتے ہو؟ عمر ضائع کردی۔ میں نے عرض کیا: حضرت! آپ کی ساری عمر علم کی خدمت میں اور دین کی اشاعت میں گزری ہے، ہزاروں آپ کے شاگرد علما ہیں جو آپ سے مستفید ہوئے اور خدمت دین میں لگے ہوئے ہیں، آپ کی عمر اگر ضائع ہوئی تو پھر کس کی عمر کام میں لگی؟ تو حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ'' میں تمہیں صحیح کہتا ہوں کہ اپنی عمر ضائع کردی'' میں نے عرض کیا کہ حضرت! اصل بات کیا ہے؟ فرمایا: ''ہماری عمروں کا، ہماری تقریروں کا، ہماری ساری کوششوں کا خلاصہ یہ رہا کہ دوسرے مسلکوں پر حنفی مسلک کی ترجیح قائم کردیں۔ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مسائل کے دلائل تلاش کریں، یہ رہا ہے محور ہماری کوششوں کا، تقریروں کا اور علمی زندگی کا۔ اب غور کرتا ہوں کہ کس چیز میں عمر برباد کی! پھر فرمایا: ''ارے میاں! اس بات کا کہ کون سا مسلک صحیح تھا اور کون سا خطاء پر؟ اس کا راز تو کہیں حشر میں بھی نہیں کھلے گا اور نہ دنیا میں اس کا فیصلہ ہوسکتا ہے اور نہ ہی قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ رفع یدین حق تھا یا ترکِ رفع یدین حق تھا؟ (نماز میں) آمین زور سے کہنا حق تھا یا آہستہ کہنا حق تھا؟ برزخ میں بھی اس کے متعلق سوال نہیں کیا جائے گا اور قبر میں بھی یہ سوال نہیں ہوگا، روزِ محشر اللہ تعالیٰ نہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کو رسوا کرے گا، نہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کو، نہ امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کو، اور نہ امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کو...... اور نہ میدان حشر میں کھڑا کرکے یہ معلوم کرے گا کہ امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح کہا تھا یا امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ نے غلط کہا تھا، ایسا نہیں ہوگا۔ تو جس چیز کا نہ دنیا میں کہیں نکھرنا ہے، نہ برزخ میں، نہ محشر میں، اس کے پیچھے پڑکر ہم نے اپنی عمر ضائع کردی اور جو صحیح اسلام کی دعوت تھی، جو سب کے نزدیک مجمع علیہ اور وہ مسائل جو سبھی کے نزدیک متفقہ تھے اور دین کی جو ضروریات سبھی کے نزدیک اہم تھیں، جن کی دعوت انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آئے تھے، جن کی دعوت کو عام کرنے کا ہمیں حکم دیا گیا تھا، وہ منکرات جن کو مٹانے کی کوشش ہم پر فرض کی گئی تھی، آج اس کی دعوت ہی نہیں دی جارہی، یہ ضروریاتِ دین تو لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہورہی ہیں اور اپنے اور اغیار سبھی دین کے چہرے کو مسخ کررہے ہیں اور وہ منکرات جن کو مٹانے میں ہمیں لگے ہونا چاہیے تھا وہ پھیل رہے ہیں، گمراہی پھیل رہی ہے، الحاد آرہا ہے، شرک و بت پرستی چلی آرہی ہے، حرام وحلال کا امتیاز اٹھ رہا ہے، لیکن ہم لگے ہوئے ہیں ان فرعی وفروعی بحثوں میں، اس لیے غمگین بیٹھا ہوں اور محسوس کررہا ہوں کہ عمر ضائع کردی''۔ (وحدت امت، ص:۱۳، مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ)

مفتی محمد شفیع رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ: حضرت مولانا سید محمد انور شاہ کشمیری رحمۃ اللہ علیہ نے ایک مرتبہ فرمایا کہ اجتہادی مسائل اور ان کے اختلاف جن میں ہم اور عام اہل علم الجھتے رہتے ہیں اور علم کا پورا زور اس پر خرچ کرتے ہیں، ان میں صحیح وغلط کا فیصلہ دنیا میں تو کیا ہوتا میرا گمان تو یہ ہے کہ محشر میں بھی

اس کا اعلان نہیں ہوگا، کیونکہ رب کریم نے جب دنیا میں کسی امام مجتہد کو باوجود خطا ہونے کے ایک اجر وثواب سے نوازا ہے اور ان کی خطا پر پردہ ڈالا ہے تو اس کریم الکرماء کی رحمت سے بہت بعید ہے کہ وہ محشر میں اپنے ان مقبولانِ بارگاہ میں سے کسی کی خطأ کا اعلان کرکے اس کو رسوا کریں۔

دو عظیم شخصیات

کالجوں یونیورسٹیوں سے نکلنے والے لوگوں میں چوٹی کی شخصیت علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ ہیں، اور مدارس ودارالعلوموں سے نکلنے والے لوگوں میں سے چوٹی کی شخصیت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ ہیں۔

شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ

مولانا مرحوم جمعیت علماء ہند کے صدر تھے، اس میں بریلوی، دیوبندی، اہل حدیث تمام علما شامل تھے۔ آپ نے تحریک ریشمی رومال چلائی تھی، آپؒ کو حجاز سے انگریزوں نے گرفتار کرکے جزیرہ مالٹا میں قید کیا تھا، چار سال قید کے بعد جب ٹی بی کا مرض تیسری سٹیج پر پہنچا تو انگریزوں نے رہا کردیا۔ آپ جب رہا ہوکر بمبئی کے ساحل پر پہنچے تو آپ کا استقبال کرنے مہاتما گاندھی بھی آیا تھا۔ رہائی کے بعد ایک مرتبہ دارالعلوم دیوبند میں علما کے ایک مجمع میں آپؒ نے فرمایا: ''ہم نے تو مالٹا کی زندگی میں دو سبق سیکھے ہیں''۔ یہ الفاظ سُن کر سارا مجمع ہمہ تن گوش ہوگیا کہ اس استاذ العلماء درویش نے اسّی سال علماء کو درس دینے کے بعد آخر عمر میں جو سبق سیکھے ہیں وہ کیا ہیں؟ فرمایا کہ:

''میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہورہے ہیں؟ تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے: ایک ان کا قرآن کریم کو چھوڑ دینا، دوسرے ان کے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی۔ اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآن کریم کو لفظاً اور معناً عام کیا جائے، بچوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں، بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے، اور مسلمانوں کے باہمی جنگ وجدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے۔''

مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

''نبّاضِ امّت نے مِلّتِ مرحومہ کے مرض کی جو تشخیص اور تجویز فرمائی تھی، باقی ایّام زندگی میں ضعف وعلالت اور ہجومِ مشاغل کے باوجود اس کے لیے سعی پیہم فرمائی''۔(وحدتِ امت)

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ:

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ نے جو حل تجویز فرمایا، وہ ہے:

وہ معزز تھے زمانے میں مسلماں ہوکر
اور تم خوار ہوئے تارک قرآں ہوکر

علامہؒ اپنی فارسی کی شاعری میں اسی بات کو ایک اور انداز سے بیان فرماتے ہیں:

خوار از مہجوریِ قرآں شدی
شکوہ سنجِ گردشِ دوراں شدی
اے چوں شبنم بر زمیں افتندہ
در بغل داری کتاب زندہ

''ہم قرآن کو چھوڑ کر خوار ہو رہے ہیں اور شکوہ زمانے کا کر رہے ہیں، اے وہ شخص جو شبنم کی طرح زمین پر گرا پڑا ہے، تیری بغل میں ایک زندہ کتاب ہے (اس سے استفادہ کر)''۔

دراصل یہ سورۂ فرقان کی اس آیت کا مفہوم ہے، جس میں اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی فریاد و استغاثہ کو ذکر فرمایا:

''وَقَالَ الرَّسُوْلُ يٰرَبِّ إِنَّ قَوْمِى اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا''۔ (الفرقان:۳۰)

''اور کہے گا رسول، اے میرے رب! میری قوم نے اس قرآن کو نظرانداز کر دیا تھا''۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن
نیست ممکن جز بہ قرآن زیستن

''اگر تو مسلمان زندہ رہنا چاہتا ہے تو یہ قرآن کے بغیر ممکن نہیں ہے''۔

اپنی تاریخ کے اوراق پلٹ کر دیکھیں، آپ کو واضح طور پر نظر آئے گا کہ جب تک مسلمانوں نے قرآن کو مضبوطی سے تھامے رکھا، اسی کو حقیقی معنوں میں اپنا ہادی و راہنما سمجھا، اپنے عمل، اخلاق اور معاملات کو اسی کے مطابق استوار رکھا تو انفرادی اور اجتماعی ہر سطح پر ان کا رعب اور دبدبہ قائم رہا، دنیا میں وہ سربلند اور غالب رہے اور اسلام کا جھنڈا چہار دانگ عالم میں لہراتا رہا، لیکن جیسے جیسے وہ کتاب اللہ سے بے پروا اور نور و حکمت کے اس خزینہ سے بے تعلق ہوتے چلے گئے، ویسے ویسے ان پر زوال کے سائے گہرے ہوتے گئے اور وہ بتدریج فساد اور انحطاط میں مبتلا ہوتے چلے گئے اور نتیجتاً مغلوب ہوگئے۔ چنانچہ سب سے پہلے ان کے عقائد خراب ہوئے، پھر اعمال بگڑے، پھر سنت کی جگہ بدعت نے لے لی، پھر ان کا اتحاد پارہ پارہ ہوگیا، وہ بیشمار فرقوں اور قومی و نسلی وجغرافیائی تعصّبات میں تقسیم ہوگئے۔

☆☆☆

اسلامی تہوار

مولانا محمد طفیل کوہاٹی

فلسفہ، اثرات، امتیازات

اللہ تعالیٰ نے انسانی نفسیات کا خاص خیال رکھا ہے، انسان کی طبعی تفریح پسندی کے ناطے مخصوص حدود وقیود کے ساتھ اُسے خوشی کے مواقع عنایت کیے گئے ہیں۔ ان حدود وقیود کی پاس داری ہر مسلمان پر لازمی اور ضروری ہے۔ اسلام میں ان خوشی کے مواقع کو''عید'' کا نام دیا جاتا ہے، اور ان کو آداب وشرائط کے ساتھ منانا باعثِ ثواب اور مستحسن ہے، لیکن آداب وشرائط کی پامالی سے یہی خوشی روزِ قیامت غم واندوہ کا باعث بنے گی۔

اسلامی تہوار

تہذیبِ اسلامی میں دو تہوار ہیں: ایک عید الفطر اور دوسرا عید الاضحیٰ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

''إِنَّ لِكُلِّ قَوْمٍ عِيْدًا و هٰذَا عِيْدُنَا۔'' (صحیح بخاری، رقم الحدیث:۳۹۳۱)

''بے شک ہر قوم کی عید ہے اور یہ (عید الفطر اور عید الاضحیٰ) ہماری عیدیں ہیں''۔

اس حدیث مبارک میں جہاں مسلمانوں کے لیے''عید'' کی تعیین کردی گئی ہے، وہاں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں اور دیگر اقوام کے تہواروں میں نمایاں فرق موجود ہے۔ اگر یہ فرق ملحوظ نہ ہوتا تو الگ طور پر عیدین کے ایام مقرر کرنے کی بجائے سابقہ اقوام وملل کی عیدوں میں سے کسی ایک دن کو مسلمانوں کے لیے بطورِ تہوار منتخب کرلیا جاتا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو اہل مدینہ سال کے دو دنوں میں کھیل کود کرتے اور خوشی مناتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دو دنوں کے بارے میں دریافت فرمایا کہ: یہ کیا ہیں؟ اہل مدینہ نے عرض کیا کہ: ان ایام میں ہم زمانۂ جاہلیت سے کھیل کود کرتے چلے آرہے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا: تمہیں اللہ تعالیٰ نے ان دو دنوں کے بدلے میں ان سے اچھے دو دن عطا فرمائے ہیں، عید البقر کا دن اور عید الفطر کا دن۔ (ابوداؤد)

اس حدیث سے وضاحت کے ساتھ اسلامی تہواروں کی تعداد اور ایام متعین ہو گئے۔ غرض

www.banuri.edu.pk

اسلامی تہذیب کے نمائندہ تہوار یہی دو ہیں اور ان کے علاوہ کوئی بھی تہوار اسلامی تہذیب کا خاصہ نہیں اور نہ ہی شریعت کی جانب سے مقرر ہے۔

اسلامی تہواروں کا فلسفہ

اسلامی تعلیمات کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ عید منانا اور خوشی کا اظہار دراصل اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ بیش بہا نعمتوں کا استحضار کیا جائے اور ان پر شکر ادا کیا جائے۔

جب سورۂ مائدہ کی آیت ''اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ'' نازل ہوئی تو بعض یہود نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے کہا کہ اگر یہ آیت ہم پر نازل کی جاتی تو ہم اس کے یوم نزول کو بطورِ عید مناتے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا: تمہیں معلوم نہیں کہ جس روز ہم پر یہ آیت نازل کی گئی، مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہوگئی تھیں۔ یہ آیت دس ہجری میں حجۃ الوداع کے موقع پر ''عرفہ'' کے دن یعنی نویں ذوالحجہ کو بروزِ جمعہ عصر کے وقت نازل ہوئی، جبکہ میدانِ عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیاء وابرار رضی اللہ عنہم کا مجمع تھا۔ (تفسیر عثمانی)

حضرت مولانا مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں کہ: ''فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا جواب اس بات کی طرف اشارہ تھا کہ وہ دن ہمارے لیے دوہری عید کا تھا، ایک عرفہ اور دوسرا جمعہ (یعنی جس طرح عرفہ اور جمعہ کے دن عبادت، قبولیتِ دعا اور منقبت کے ہیں، اسی طرح عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہیں)۔'' (معارف القرآن، ج:۳، ص:۳۴)

معلوم ہوا کہ مسلمانوں کی عید کا فلسفہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر، مناجات ودعا، ایثار وقربانی اور باہمی اتحاد و یکجہتی ہے، نہ کہ محض خوشی وطرب جو روحانیت سے خالی ہو۔

مفتی شفیع صاحب رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں: ''(فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے) اس جواب سے یہ بھی پتہ چلا کہ یہود ونصاریٰ کی طرح ہماری عیدیں، تاریخی واقعات کے تابع نہیں کہ جس تاریخ کو کوئی اہم واقعہ پیش آگیا ہو، اس کو عید منانا شروع کردیا، جیسا کہ جاہلیتِ اُولیٰ کی رسم تھی۔'' (معارف القرآن، ج:۳، ص:۳۴)

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں: ''جن ایام کو اسلام نے تہوار کے لیے مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو ماضی میں ایک مرتبہ پیش آکر ختم ہوچکا ہو، بلکہ اس کے بجائے ایسے خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا، جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمائی ہیں، جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، چنانچہ عید الفطر رمضان کے گزرنے کے بعد رکھی ہے کہ میرے بندے پورے مہینے عبادت کے اندر مشغول رہے، اس کی خوشی اور انعام میں یہ عید الفطر مقرر فرمائی اور عید الاضحیٰ ایسے موقع پر مقرر فرمائی جب مسلمان ایک دوسری عظیم عبادت یعنی حج کی تکمیل کرتے ہیں، اس لیے کہ حج کا سب سے بڑا رکن وقوفِ عرفہ ۹/ذوالحجہ کو ادا کیا جاتا ہے، اس تاریخ کو پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمان میدانِ عرفات میں جمع ہوکر اللہ تعالیٰ کی عظیم عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، اس عبادت کی تکمیل کے اگلے

دن یعنی دس ذوالحجہ کو اللہ تعالیٰ نے دوسری عید یعنی عید الاضحیٰ مقرر فرمائی۔‘‘ (اصلاحی خطبات، ج:۱۲،ص:۹۰)

اسلامی معاشرے پر تہواروں کے اثرات اور ان کے امتیازات

اسلامی معاشرے پر تہواروں کے بڑے دوررس اور دیرپا اثرات مرتب ہوئے ہیں اور انہی اثرات کی وجہ سے وہ اقوام عالم کے تہواروں سے ممتاز ہیں، ان میں سے چند ایک کا تذکرہ پیش خدمت ہے۔

روحانیت

اسلام نے تہواروں کو عیش وطرب کا نمونہ نہیں رکھا جو اخلاقی قدروں کو بہالے جائے اور انسان کے روحانی تقاضوں سے متصادم ہو، بلکہ ان میں عبادت کے ایسے پر جوش مظاہر رکھے ہیں، جو روحانیت وللّٰہیت اور صدق وخلوص کے حصول کا ذریعہ بنتے ہیں۔ اسلامی حدود و قیود کے ساتھ منائی جانے والی عیدیں پاکیزہ طبیعتوں میں تدین وخدا پرستی کے جذبات پیدا کرتی ہیں اور انسان کے جذبۂ عمل صالح کو مہمیز بخشتی ہیں۔ جب تک اسلامی معاشرہ اور تہذیب اپنے طمطراق سے قائم تھی، اسلامی تہواریں اُن پر اپنا روحانی اثر ثبت کرتی رہیں اور مسلمانوں کی روحانی غذا کا سامان بنتی رہیں۔ باطنی صفائی کے ساتھ تہواروں میں ظاہری طہارت ونظافت کا درجہ بھی ’’عبادت‘‘ ہے۔ وضو، غسل، صاف ستھرا لباس، خوشبو، مسواک اور دیگر نظافتیں انسان کے ظاہر کو نکھارتی ہیں۔ اسلامی تہواروں میں طہارت ونظافت کے حصول کو باعث اجر وثواب بتایا گیا ہے، جس کے حصول میں ایک طرف ظاہر کی آراستگی ہے اور دوسری طرف اس کے باطن پر پڑنے والے اثرات ہیں، کیونکہ ظاہر کی صفائی کا تزکیۂ باطن پر نمایاں اثر پڑتا ہے۔

اتحاد و یگانگت

اسلامی تہواروں میں اجتماع ومجامع کے مظاہر وجوبی حیثیت رکھتے ہیں، دونوں تہواروں میں نماز عید کو ’’بڑے مجمع‘‘ کے ساتھ ادا کرنا واجب رکھا گیا ہے، ایک طرف یہ اجتماعی عبادت رحمتِ الٰہی کی توجہ کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف اسلامی معاشرے کے تمام طبقات کو اکٹھا ہونے اور اتحاد ویگانگت کے مظاہرہ کا سنہری موقع بھی بہم پہنچاتی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دونوں تہواروں سے پہلے جن عبادات کی تکمیل ہوتی ہے، ان میں بھی اجتماع کی شان نمایاں ہے۔ عید الفطر سے قبل تراویح کی اضافی عبادت کو سنت مؤکدہ رکھا گیا ہے، اس کی ادائیگی اجتماعی ہیئت کے ساتھ ہوتی ہے اور چونکہ سال بھر میں صرف ایک مہینہ ہوتی ہے، اس لیے اجتماع کا جوش وخروش اور باہمی اُلفت ویگانگت ممتاز دکھائی دیتی ہے، جبکہ عید الاضحیٰ سے قبل حج کی تکمیل ہوتی ہے، جو دنیا میں رائج تمام تہذیبوں اور ملتوں میں کسی ملت کا سب سے بڑا، منظم اور عالمگیر اجتماع ہے، دنیا بھر کے لاکھوں مسلمان بلا تفریقِ رنگ ونسل اور زبان ووطن ایک ہی معمول پر، ایک ہی مکان میں اور ایک ہی وقت پر اکٹھے ہو کر جہاں عظیم دینی عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، وہاں نظم وضبط، ترتیب ونسق اور اتحاد

ویگانگت کی وہ مثال پیش کرتے ہیں، جس کا مظاہرہ اسلامی تہذیب کے سوا کہیں نہیں ملتا۔ ان مجامع کے اتحاد کا اثر اسلامی معاشرے پر انتہائی دیرپا اور مؤثر انداز میں مرتب ہوتا ہے اور اسلامی معاشرہ میں دنیا بھر کے مسلمانوں کے ساتھ بھائی چارے، یکجہتی اور محبت ومودّت کا شعور اُجاگر ہوتا ہے۔

ایثار وقربانی

اسلامی تہوار محض انفرادی خوشی منانے کا نام نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی انجام دہی میں ایسی عبادتیں رکھ دی ہیں، جو ایثار وقربانی کا درس دیتی ہیں اور اسلامی معاشرہ میں اجتماعی خوشی منانے کے جذبہ کو مہمیز بخشتی ہیں، مثلاً عیدالفطر کی نماز سے پہلے پہلے اللہ تعالیٰ نے ہر مسلمان چھوٹے بڑے پر صدقہ فطر واجب قرار دیا ہے، جو اسلامی معاشرہ کے ان غریب طبقات پر خرچ کیا جائے گا جن کے پاس ایسے مواقع پر خوشی کے اسباب اختیار کرنے کی وسعت وگنجائش یا تو ہوتی نہیں یا بہت محدود ہوتی ہے، تاکہ یہ طبقات احساسِ کمتری کا شکار نہ ہوں اور ان مقدس ایام میں اپنے اور اپنے بچوں کے واسطے کھانے پینے اور لباس کا مناسب بندوبست کرسکیں۔ اسی طرح عیدالاضحیٰ میں صاحب استطاعت مسلمانوں پر جانور کی قربانی واجب قرار دی گئی، چونکہ یہ تہوار اللہ تعالیٰ کی جانب سے مہمانی ہوتی ہے، تاکہ اُس کے بندے اس خوشی میں اعلیٰ ترین غذا ''گوشت'' کا لطف اٹھائیں، اس لیے اللہ تعالیٰ نے معاشرے کے صاحبِ ثروت طبقات کو جانور کی ''قربانی'' پیش کرنے کا حکم دیا۔ یہ قربانی جہاں عمل ابراہیمی کی یادگار، حب مال کے رذیلہ کا حکیمانہ علاج، دین کے لیے مال وجان کی قربانی پیش کرنے کے جذبے کا حصول اور اللہ تعالیٰ کے دربار سے بے پایاں اجروثواب کمانے کا ذریعہ ہے، وہاں معاشرے کے غریب طبقات کو اپنے ساتھ اس خوشی اور پرلطف غذا میں شریک کرنا ہے۔ اسلامی تہوار کا یہ پہلو مسلمانوں کے دلوں میں ''ایثار وقربانی'' کا لازوال جذبہ پیدا کرتا ہے اور اُنہیں یہ شعور بخشتا ہے کہ دولت وثروت چند ہاتھوں میں سمیٹ کر رکھنے کی شے نہیں، بلکہ اسلام کا مزاج معاشرے کے تمام طبقات میں اس کی مناسب ''گردش'' پر مبنی ہے، تاکہ کوئی طبقہ اس قدر ذلت وکہتری کا شکار نہ ہو کہ مایوسی کے پاتال میں پڑا رہے اور اُسے زندگی کی جائز خوشیاں بھی نصیب نہ ہوں۔

ذوقِ عبادت کی فراوانی

اسلامی تہوار عبادت ہی کی تکمیل کا انعام ہیں اور خود ان تہوارں میں بھی جانی ومالی عبادات کے مختلف مظاہر رکھے گئے ہیں، جو لوگ عام حالات کے اندر ذوقِ عبادت میں کوتاہ سمجھے جاتے ہیں، وہ بھی ایسے اجتماعی مواقع پر ''عبادت'' میں جوش وخروش دکھاتے ہیں اور اس کا کافی اہتمام کرتے ہیں۔ ان مواقع میں عبادات کا جوش واہتمام معاشرے میں دُعا وعبادت کا ذوق پیدا کرتا ہے۔ یہ اسلامی تہواروں کا ہی امتیاز ہے کہ خوشی وتفریح کے یہ مواقع دینی بیداری اور مذہبی میلان کا باعث بنتے ہیں

اور معاشرے میں مذہبی و دینی رجحانات کو جلا بخشتے ہیں، ورنہ اقوام عالم کے تہواروں نے تو ان کی مذہبی تعلیمات کا جنازہ نکالنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔

سادگی وزہدوقناعت

اسلامی تہواروں میں دیگر مذاہب کے تہواروں کی طرح عیش وطرب اور لہو ولعب کی ممانعت ہے، خوشی کی آڑ میں اسراف وتبذیر اور تصنیع وتعیش کی ہرگز اجازت نہیں، کیونکہ ان چیزوں کا التزام ورواج مآلاً خوشی کو وبال میں بدل دیتا ہے اور معاشرے کے لاچار اور غریب طبقات میں احساسِ کمتری وکہتری کا باعث بنتا ہے۔ اسلام نے خوشی کے ان مواقع میں سادگی وزہدوقناعت کا بنیادی اُصول برقرار رکھا ہے، نئے لباس یا عمدہ ومہنگے کھانوں کا کوئی التزام نہیں، بس صاف ستھرا لباس پہننا مسنون ہے، اگر چہ پرانا ہو۔ اسلام کی تعلیم ہے کہ کھانے پینے میں بھی اپنی وسعت وگنجائش کو مدِ نظر رکھا جائے اور ان مادی اشیاء سے نفس کو طراوت بخشنے کی بجائے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کے استحضار اور ذکر وعبادت سے جی خوش کرنے کا اہتمام کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا استعمال اور اظہار کوئی امرِ ممنوع نہیں، مقصود یہ ہے کہ سادگی وقناعت کا جوہر ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے، ضروری راحت وآرام اور تسکین وتفریح کے سامان سے شرعی حدود میں رہ کر مستفید ہوا جائے اور اغیار کی طرح آرام وآسائش اور تفریح وتسکین کے لیے اسراف وتبذیر کا ارتکاب نہ کیا جائے۔ تہواروں میں سادگی اور قناعت کے یہ مظاہر اسلامی معاشرے میں نجی اور انفرادی خوشی کے مواقع پر گہرا اثر مرتب کرتے ہیں اور یہ شعور اُجاگر کرتے ہیں کہ خوشی منانے کا مطلب یہ نہیں کہ اللہ کی نعمتوں کو بے دریغ لٹایا اور ضائع کیا جائے، بلکہ ان کا شکر ہی خوشی کی اصل روح ہے۔

غیرت وحمیت کی بڑھوتری

اسلامی تہواروں میں ایسے نشاطات کا اہتمام جو اسلامی تعلیمات سے متصادم نہ ہوں، مباح ہے، مثلاً غیرت وحمیت کا جذبہ موجزن کرنے کے لیے نظمیں اور ترانے پڑھنا، یا جہادی مظاہروں اور کھیلوں کا انعقاد کرنا۔ اس سے معاشرے میں جذبۂ حریت، قومی وملی غیرت اور اسلامی حمیت روز افزوں ہوتی ہے اور تفریح کا مناسب سامان بھی مہیا ہوتا ہے۔ ان مثبت تفریحی سرگرمیوں کا اسلامی معاشرے پر گہرا اثر مرتب ہوتا ہے اور من حیث القوم ایک نشیط، بیدار مغز اور پر حمیت نسل پروان چڑھتی ہے۔

اسلامی تہواروں کے ان اثرات ومقاصد کے پیشِ نظر اب قابلِ غور امر یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں رواج پانے والے اغیار کے رسوم وتہوار اور ان میں نسلِ نو کی دلچسپی سے کیا معاشرے پر مثبت اثرات مرتب ہوں گے؟ ہرگز نہیں! بلکہ مسلمانوں کے اپنے تہوار بھی ان اثرات ومقاصد کو کھو دیں گے، جیسا کہ مشاہد ہے۔

اولاد کی ظاہری و باطنی تربیت

محمد شفیق الرحمٰن علوی

اہمیت.....انداز

بچے مستقبل میں قوم کے معمار ہوتے ہیں، اگر اُنہیں صحیح تربیت دی جائے تو اس کا مطلب ہے ایک اچھے اور مضبوط معاشرے کے لیے ایک صحیح بنیاد ڈال دی گئی۔ بچوں کی اچھی تربیت سے ایک مثالی معاشرہ اور قوم وجود میں آتی ہے، اس لیے کہ ایک اچھا پودا ہی مستقبل میں تناور درخت بن سکتا ہے۔

بچپن کی تربیت نقش کالحجر ہوتی ہے، بچپن میں ہی اگر بچہ کی صحیح دینی واخلاقی تربیت اور اصلاح کی جائے تو بلوغت کے بعد بھی وہ ان پر عمل پیرا رہے گا۔ اس کے برخلاف اگر درست طریقہ سے ان کی تربیت نہ کی گئی تو بلوغت کے بعد ان سے بھلائی کی زیادہ توقع نہیں کی جاسکتی، نیز بلوغت کے بعد وہ جن برے اخلاق واعمال کا مرتکب ہوگا، اس کے ذمہ دار اور قصوروار والدین ہی ہوں گے، جنہوں نے ابتدا سے ہی ان کی صحیح رہنمائی نہیں کی۔ نیز! اولاد کی اچھی اور دینی تربیت دنیا میں والدین کے لیے نیک نامی کا باعث اور آخرت میں کامیابی کا سبب ہے، جب کہ نافرمان و بے تربیت اولاد دنیا میں بھی والدین کے لیے وبالِ جان ہوگی اور آخرت میں بھی رسوائی کا سبب بنے گی۔

لفظِ ''تربیت'' ایک وسیع مفہوم رکھنے والا لفظ ہے، اس لفظ کے تحت افراد کی تربیت، خاندان کی تربیت، معاشرہ اور سوسائٹی کی تربیت، پھر ان قسموں میں بہت سی ذیلی اقسام داخل ہیں۔ ان سب اقسام کی تربیت کا اصل مقصد وغرض عمدہ، پاکیزہ، بااخلاق اور باکردار معاشرہ کا قیام ہے۔ تربیتِ اولاد بھی اُنہیں اقسام میں سے ایک اہم قسم اور شاخ ہے۔

آسان الفاظ میں ''تربیت'' کی تعریف یوں کی جاسکتی ہے کہ: ''برے اخلاق وعادات اور غلط ماحول کو اچھے اخلاق وعادات اور ایک صالح، پاکیزہ ماحول سے تبدیل کرنے کا نام ''تربیت'' ہے۔''

تربیت کی دو قسمیں:

تربیت دو قسم کی ہوتی ہے: ۱:...... ظاہری تربیت، ۲:...... باطنی تربیت۔ ظاہری اعتبار سے تربیت میں اولاد کی ظاہری وضع قطع، لباس، کھانے، پینے، نشست و برخاست، میل جول، اس کے

www.banuri.edu.pk

دوست واحباب اور تعلقات ومشاغل کو نظر میں رکھنا، اس کے تعلیمی کوائف کی جانکاری اور بلوغت کے بعد ان کے ذرائع معاش وغیرہ کی نگرانی وغیرہ امور شامل ہیں، یہ تمام امور اولاد کی ظاہری تربیت میں داخل ہیں۔ اور باطنی تربیت سے مراد اُن کے عقیدہ اور اخلاق کی اصلاح ودرستگی ہے۔

اولاد کی ظاہری اور باطنی دونوں قسم کی تربیت والدین کے ذمہ فرض ہے۔ ماں باپ کے دل میں اپنی اولاد کے لیے بے حد رحمت وشفقت کا فطری جذبہ اور احساس پایا جاتا ہے۔ یہی پدری ومادری فطری جذبات واحساسات ہی ہیں جو بچوں کی دیکھ بھال، تربیت اور اُن کی ضروریات کی کفالت پر اُنہیں اُبھارتے ہیں۔ ماں باپ کے دل میں یہ جذبات راسخ ہوں اور ساتھ ساتھ اپنی دینی ذمہ داریوں کا بھی احساس ہو تو وہ اپنے فرائض اور ذمہ داریاں احسن طریقہ سے اخلاص کے ساتھ پوری کرسکتے ہیں۔

قرآن مجید اور احادیث نبویہ میں اولاد کی تربیت کے بارے میں واضح ارشادات موجود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

''قُوْا أَنْفُسَكُمْ وَأَهْلِيْكُمْ نَارًا وَّقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ''۔ (التحریم:۶)

ترجمہ: ''اپنے آپ کو اور اپنی اولاد کو اس آگ سے بچاؤ جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہیں''۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس آیت کی تفسیر وتشریح میں فرمایا کہ:

''علموهم وأدِّبوهم''۔

ترجمہ: ''ان (اپنی ولاد) کو تعلیم دو اور ان کو ادب سکھاؤ''۔

فقہاء کرام نے لکھا ہے کہ: ہر شخص پر فرض ہے کہ اپنے بیوی بچوں کو فرائض شرعیہ اور حلال وحرام کے احکام کی تعلیم دے اور اس پر عمل کرانے کے لیے کوشش کرے۔

اولاد کی تربیت کی اہمیت کا اندازہ ان احادیث سے بھی ہوتا ہے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

۱: ''مانحل والد أفضل من أدب حسن''۔ (بخاری، جلد:۱، ص:۴۲۲)

ترجمہ: ''کوئی باپ اپنی اولاد کو اس سے بہتر عطیہ نہیں دے سکتا کہ اس کو اچھے آداب سکھادے''۔

یعنی اچھی تربیت کرنا اور اچھے آداب سکھانا اولاد کے لیے سب سے بہترین عطیہ ہے۔

۲: ''عن ابن عباسؓ...... قالوا: يارسول الله! قد علمنا ما حق الوالد فماحق الولد؟ قال: أن يحسن اسمه ويحسن أدبه''۔ (سنن بیہقی)

ترجمہ: ''حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے، صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے عرض کیا: یارسول اللہ! والدین کے حقوق تو ہم نے جان لیے، اولاد کے کیا حقوق ہیں؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ یہ ہے کہ اس کا نام اچھا رکھے اور اس کی اچھی تربیت کرے''۔

۳: ''یہ بہت بڑا گناہ ہے کہ انسان جن کا ذمہ دار ورکھوالا ہے، اُنہیں ضائع کردے،

ان کی تربیت نہ کرے''۔

یہ بھی ضائع کرنا ہے کہ بچوں کو یونہی چھوڑ دینا کہ وہ بھٹکتے پھریں، صحیح راستہ سے ہٹ جائیں، ان کے عقائد و اخلاق برباد ہو جائیں۔ نیز اسلام کی نظر میں ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے، بچوں کی تربیت کے سلسلہ میں جن امور کا جاننا ضروری ہے، اُس میں کوتاہی کرنا قیامت کی باز پرس سے نہیں بچا سکتا۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا ارشاد ہے:

''اپنی اولاد کو ادب سکھلاؤ، قیامت والے دن تم سے تمہاری اولاد کے بارے میں پوچھا جائے گا، کہ تم نے اسے کیا ادب سکھلایا؟ اور کس علم کی تعلیم دی؟۔'' (شعب الإیمان للبیہقی)

بچوں کی حوصلہ افزائی

بچہ نرم گیلی مٹی کی طرح ہوتا ہے، ہم اس سے جس طرح پیش آئیں گے، اس کی شکل ویسی ہی بن جائے گی۔ بچہ اگر کوئی اچھا کام کرے تو اس کی حوصلہ افزائی کے لیے اس کی تعریف سے دریغ نہیں کرنا چاہیے اور اس پر اُسے شاباش اور کوئی ایسا تحفہ وغیرہ دینا چاہیے جس سے بچہ خوش ہو جائے اور آئندہ بھی اچھے کام کا جذبہ اور شوق اس کے دل میں پیدا ہو جائے۔

بچوں کی غلطی پر اُنہیں تنبیہ کرنے کا حکیمانہ انداز

بچوں کو کسی غلط کام پر بار بار اور مسلسل ٹوکنا اُن کی طبیعت میں غلط چیز راسخ ہونے سے حفاظت کا سبب بنتا ہے، جس سے اگر غفلت نہ برتی گئی تو اس میں شک نہیں کہ بچوں اور بچیوں میں غلط افکار جڑ پکڑنے سے پہلے کامل طریقہ سے ان کی بیخ کنی ہوگی۔ بچے سے خطأ ہو جانا کوئی اچھنبے کی بات نہیں ہے، غلطی تو بڑوں سے بھی ہو جاتی ہے۔ ماحول کا بچوں پر اثر ہوتا ہے، ممکن ہے کہ غلط ماحول کی وجہ سے بچہ کوئی غلطی کر بیٹھے، تو اس صورت حال کو بھی مدنظر رکھنا چاہیے کہ بچے سے غلطی کس سبب سے ہوئی؟ اسی اعتبار سے اسے سمجھایا اور تنبیہ کی جائے۔ تربیت میں میانہ روی اور اعتدال کا راستہ اختیار کرنا چاہیے، مربی کو اس بات سے باخبر ہونا چاہیے کہ اس وقت بچہ کے لیے نصیحت کارگر ہے یا سزا؟ تو جہاں جس قدر سختی اور نرمی کی ضرورت ہو اسی قدر کی جائے۔ بہت زیادہ سختی اور بہت زیادہ نرمی بھی بعض اوقات بگاڑ کا سبب بنتی ہے۔ متنبّی شاعر کہتا ہے:

فوضع الندی فی موضع السیف بالعلا   مضر کوضع السیف فی موضع الندی

ترجمہ: ''جہاں تلوار چلانی ہو وہاں سخاوت اتنی ہی نقصان دہ ہے جتنا کہ سخاوت کے موقع پر تلوار چلانا''۔

تربیت میں تدریجی انداز اختیار کرنا چاہیے، چنانچہ غلطی پر تنبیہ کی ترتیب یوں ہونی چاہیے:

ا:......سمجھانا۔ ۲:......ڈانٹ ڈپٹ کرنا۔ ۳:...... مار کے علاوہ کوئی سزا دینا۔ ۴:...... مارنا۔ ۵:...... قطع

تعلق کرنا۔ یعنی غلطی ہو جانے پر بچوں کی تربیت حکمت کے ساتھ کی جائے، اگر پہلی مرتبہ غلطی ہو تو اولاً اُسے اشاروں اور کنایوں سے سمجھایا جائے، صراحۃً برائی کا ذکر کرنا ضروری نہیں۔ اگر بچہ بار بار ایک ہی غلطی کرتا ہے تو اس کے دل میں یہ بات بٹھائیں کہ اگر دوبارہ ایسا کیا تو اس کے ساتھ سختی برتی جائے گی، اس وقت بھی ڈانٹ ڈپٹ کی ضرورت نہیں ہے، نصیحت اور پیار سے اُسے غلطی کا احساس دلایا جائے۔

بچہ کی پیار و محبت سے تربیت و اصلاح کا ایک واقعہ حضرت عمر بن ابی سلمہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے، فرماتے ہیں کہ: میں بچپن میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زیر تربیت اور زیر کفالت بچہ تھا، میرا ہاتھ کھانے کے برتن میں اِدھر اُدھر گھوم رہا تھا، یہ دیکھ کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا: ''**یا غلام سم اللّٰہ! وکل بیمینک وکل ممایلیک**''.... ''اے لڑکے! اللہ کا نام لے کر کھانا شروع کرو اور دائیں ہاتھ سے کھاؤ اور اپنی طرف سے کھاؤ۔''

اگر نصیحت اور آرام سے سمجھانے کے بعد بھی بچہ غلطی کرے تو اُسے تنہائی میں ڈانٹا جائے اور اس کام کی برائی بتائی جائے اور آئندہ ایسا نہ کرنے کا کہا جائے۔ پھر بھی اگر باز نہ آئے تو تھوڑی بہت مار پیٹ بھی کی جاسکتی ہے۔ تربیت کے یہ طریقے نوعمر بچوں کے لیے ہیں، لیکن بلوغت کے بعد تربیت کے طریقے مختلف ہیں، اگر اس وقت نصیحت سے نہ سمجھے تو جب تک وہ اپنی برائی سے باز نہ آئے اس سے قطع تعلق بھی کیا جاسکتا ہے، جو شرعاً درست ہے اور کئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے عمل سے ثابت ہے۔ حضرت عبداللہ بن مغفل رضی اللہ عنہ کے ایک رشتہ دار تھے جو ابھی بالغ نہ ہوئے تھے، انہوں نے کنکر پھینکا تو حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ نے منع کیا اور فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کنکر مارنے سے منع فرمایا ہے اور فرمایا ہے کہ: ''**إنھا لاتصید صیدًا**'' اس سے کوئی جانور شکار نہیں ہوسکتا، اس نے پھر کنکر پھینکا تو انہوں نے غصہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتلا رہا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے اور تم پھر دوبارہ ایسا ہی کر رہے ہو؟ میں تم سے ہرگز بات نہیں کروں گا۔ اسی طرح حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے اپنے بیٹے (بلال) سے حدیث کے مقابلہ میں اپنی رائے پیش کرنے کی بنا پر قطع تعلق کیا تھا اور مرتے دم تک اس سے بات نہ کی۔

بچوں کو ڈانٹنے اور مارنے کی حدود

بچوں کی تربیت کے لیے ماں باپ یا استاد کا اُنہیں تھوڑا بہت، ہلکا پھلکا مارنا نہ صرف یہ کہ جائز ہے، بلکہ بعض اوقات ضروری ہو جاتا ہے۔ اس معاملہ میں افراط وتفریط کا شکار نہیں ہونا چاہیے۔ غصہ میں بے قابو ہو جانا اور حد سے زیادہ مار کٹائی کرنا یا بچوں کے مارنے ہی کو غلط سمجھنا دونوں باتیں غلط ہیں۔ پہلی صورت میں افراط ہے اور دوسری میں تفریط ہے۔ اعتدال کا راستہ وہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں بیان فرمایا کہ: ''اپنے بچوں کو نماز کا حکم دو، جبکہ وہ سات سال کے ہو جائیں اور ان کو نماز نہ پڑھنے پر مارو، جبکہ وہ دس سال کے ہو جائیں''۔ (مشکوۃ) اس

حدیث سے مناسب موقع پر حسبِ ضرورت مارنے کی اجازت معلوم ہوتی ہے۔

مارنے میں اس بات کا بھی خیال رکھا جائے کہ اس حد تک نہ مارا جائے کہ جسم پر مار کا نشان پڑ جائے۔ نیز جس وقت غصہ آ رہا ہو، اس وقت بھی نہ مارا جائے، بلکہ بعد میں جب غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو اس وقت مصنوعی غصہ ظاہر کر کے مارا جائے، کیونکہ طبعی غصہ کے وقت مارنے میں حد سے تجاوز کر جانے کا خطرہ ہوتا ہے اور مصنوعی غصہ میں یہ خطرہ نہیں ہوتا، مقصد بھی حاصل ہو جاتا ہے اور تجاوز بھی نہیں ہوتا۔

لڑکوں کو لڑکیوں پر ترجیح دینا گناہ ہے

اولاد اللہ تعالیٰ کی بیش بہا نعمت اور تحفہ ہے، خواہ لڑکا ہو یا لڑکی۔ اسلامی تعلیمات کی رو سے بچوں پر رحم وشفقت کے معاملہ میں مذکر ومؤنث میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ جو والدین لڑکے کی بنسبت لڑکی سے امتیازی سلوک کرتے ہیں، وہ جاہلیت کی پرانی برائی میں مبتلا ہیں، اس طرح کی سوچ اور عمل کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، بلکہ دینی اعتبار سے تو اس پر سخت وعیدیں وارد ہوئی ہیں۔ لڑکی کو کمتر سمجھنے والا درحقیقت اللہ تعالیٰ کے اس فیصلے سے ناخوشی کا اظہار کرتا ہے جو اللہ تعالیٰ نے اُسے لڑکی دے کر کیا ہے، ایسے آدمی کو سمجھ لینا چاہیے کہ وہ تو کیا پوری دنیا بھی مل کر اللہ تعالیٰ کے اس اٹل فیصلہ کو تبدیل نہیں کرسکتی۔ یہ درحقیقت زمانۂ جاہلیت کی فرسودہ اور قبیح سوچ ہے، جس کو ختم کرنے کے لیے رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم نے والدین اور تربیت کرنے والوں کو لڑکیوں کے ساتھ اچھے برتاؤ اور ان کی ضروریات کا خیال رکھنے کی بار بار نصیحت کی۔

اولاد کے درمیان برابری اور عدل

ابوداؤد شریف میں حضرت نعمان بن بشیرؓ کی حدیث ہے:

’’قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: اعدلوا بین أبنائکم اعدلوا بین أبنائکم اعدلوا بین أبنائکم‘‘۔ (ابوداؤد، جلد:۲،ص:۱۴۴)

ترجمہ:’’رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو، اپنی اولاد کے درمیان برابری کرو‘‘۔

مطلب یہ ہے کہ ظاہری تقسیم کے اعتبار سے سب بچوں میں برابری کرنی چاہیے، کیونکہ اگر برابری نہ ہو تو بچوں کی دل شکنی ہوتی ہے۔ ہاں! فطری طور پر کسی بچے سے دلی طور پر زیادہ محبت ہو تو اس پر کوئی پکڑ نہیں، بشرطیکہ ظاہری طور پر برابری رکھے۔ حدیث میں تین بار مکرر برابری کی تاکید کی ہے جو اس کے واجب ہونے پر دلالت کرتی ہے، یعنی اولاد کے درمیان برابری کرنا واجب ہے، اور برابری نہ کرنا ظلم شمار ہوگا۔ اور اس کا خیال نہ رکھنا اولاد میں احساسِ کمتری اور باغیانہ سوچ کو جنم دیتا ہے، جس کے بعد میں بہت بھیانک نتائج سامنے آتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمان والدین کو اپنی اولاد سے متعلق ذمہ داریاں احسن طریقہ سے نبھانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

موجودہ دور میں شریعتِ اسلامیہ کا نفاذ کس طرح ممکن ہے؟

مولانا محمد سمیع اللہ

اللہ تعالیٰ نے اپنے خصوصی فضل وکرم سے مسلم لیگ (ن) کو صدارت اور وزارتِ عظمیٰ کے دونوں عہدے عطا کیے ہیں۔ اب اُن کی جماعت پر بھاری ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ ملک کی نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی طرف خصوصی توجہ دے، تاکہ پاکستان کے مطالبہ کا بنیادی مقصد یعنی ''پاکستان کا مطلب کیا؟ لا إلٰہ إلا اللّٰہ'' (جو پچھلے ۶۷ سال سے کھٹائی میں پڑا ہے) پورا ہو سکے۔ عظیم المیہ یہ ہے کہ ماضی میں اقتدار پر براجمان طبقہ اپنی آئینی ذمہ داریوں سے مجرمانہ غفلت کا بدستور مرتکب رہا ہے۔ اب بھی صورتحال جوں کی توں رہی اور ہم نے اپنا قبلہ درست نہ کیا تو خدانخواستہ ہم مزید قہر خداوندی کے مستحق نہ بن جائیں!

سابق صدر ایوب خان کے دورِ اقتدار میں نافذ کردہ عائلی قوانین جن کی کئی دفعات شریعت اسلامیہ سے متصادم ہیں، ان کو قرآن وسنت کے مطابق تشکیل دیتے ہوئے قانون سازی کا کام عرصہ دراز سے التواء میں پڑا ہے۔ یاد رہے کہ صدر ایوب خان نے مغربی تہذیب کی دلدادہ خواتین کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے ڈاکٹر فضل الرحمٰن، ڈائریکٹر ادارہ تحقیقات اسلامی (وزارت مذہبی اُمور) کے ایما پر خلافِ شرع یہ عائلی قوانین بذریعہ آرڈیننس ۱۹۶۱ء میں قوم پر مسلط کیے، جس کا خمیازہ ہم آج تک اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کی صورت میں بھگت رہے ہیں۔ اُس کی ایک واضح مثال مروجہ سرکاری نکاح فارم ہے، جس کی شریعت سے متصادم کئی دفعات کو آج تک تبدیل نہیں کیا گیا۔

باوثوق ذرائع سے ہمارے علم میں یہ بات آئی ہے کہ ایک نجی محفل میں بحالتِ کشف شیخ التفسیر مولانا احمد علی لاہوری رحمۃ اللہ علیہ نے علی الاعلان ارشاد فرمایا تھا کہ ایوب خان آگ میں جل رہا ہے کہ وہ پاکستان کا پہلا حکمران تھا جس نے مداخلت فی الدین کی ابتدا کی اور شریعت کے احکامات میں تحریف کی بنیاد ڈالی، جبکہ ڈاکٹر فضل الرحمٰن اُس کے بہت قریب اور دینی معاملات میں اُس کا مشیر خاص تھا۔

جب تک ہم اللہ اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اعلانِ جنگ (یعنی سود کا خاتمہ) اور رُسوائے زمانہ عائلی قوانین کی غیر شرعی دفعات کو کالعدم قرار نہیں دیتے، ہم اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل نہیں کر سکتے۔ کچھ

گمنام اولیاء کرام نے یہ عندیہ دیا ہے کہ پاکستان کی اس زمین کے نیچے تیل، گیس اور معدنیات کے وسیع ذخائر پوشیدہ ہیں جو یہاں اُس وقت تک ظاہر نہیں ہوں گے جب تک کہ یہاں طارق بن زیاد رحمۃ اللہ علیہ جیسا مرد مومن حکمران جو کشتیوں کو جلا کر شریعتِ اسلامیہ کو بذریعہ نظام خلافت نافذ کرنے کا عزم نہ لے کر آئے۔

اب تو حکمران جماعت کا فرض بنتا ہے کہ وہ اپنے اس تیسرے دورِ حکومت میں کم از کم ان دو بنیادی بُرائیوں (یعنی سُود اور خلافِ شرع عائلی قوانین) کو جڑ سے اُکھاڑ پھینکیں، پھر دیکھیں کہ اللہ کی نصرت کس طرح آتی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

۱:...... ’’وَالَّذِيْنَ جَاهَدُوْا فِيْنَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا ‘‘۔ (سورۃ العنکبوت:۶۹)

’’اور جن لوگوں نے ہمارے لیے کوشش کی ہم ان کو ضرور اپنے رستے دکھا دیں گے۔‘‘

۲:...... ’’وَلَا تَهِنُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَنْتُمُ الْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ‘‘۔ (آل عمران:۱۳۹)

’’اور بے دل اور غمگین نہ ہونا، اگر تم مومن (صادق) ہو تو تم ہی غالب رہو گے‘‘۔

۳:...... ’’اِنْ تَنْصُرُوا اللّٰهَ يَنْصُرْكُمْ ‘‘۔ (محمد:۷)

’’اگر تم اللہ (کے دین) کی مدد کرو گے تو وہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔‘‘

اللہ تعالیٰ کے دین کی مدد یہ ہے کہ اہل ایمان، اللہ کے حکموں پر عمل کریں، کیونکہ اللہ کے وعدے اس کے احکام پر عمل کرنے والوں کے ساتھ ہیں۔

خاتمۂ سُود کے لیے عملی اقدامات

خاتمۂ سود کے عملی اقدامات کے لیے دین دار ماہرین اقتصادیات بالخصوص ڈاکٹر ارشد زمان، درد دل رکھنے والے ممتاز سول سرونٹ اوریا مقبول جان اور نامور صحافی انصار عباسی جیسے بے لوث لوگوں کی خدمات سے استفادہ کیا جائے کہ سُود کی اس لعنت نے ملک کو دیوالیہ بنا دیا ہے اور اس کی موجودگی میں کبھی ہم اپنے پاؤں پر کھڑے نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ غیروں کے محتاج اور قرض دار رہیں گے۔ اغیار کی معاشی غلامی یا اپنے وسائل پر خود انحصاری میں کسی ایک راستہ کا انتخاب کرنا ہوگا۔ اگر نیک نیتی سے ہمارا نصب العین سودی معیشت سے چھٹکارا ہو اور اس کے لیے ہم اخلاص سے اسلام کے معاشی اُصولوں کے مطابق جدو جہد کریں تو لازمی طور پر اللہ تعالیٰ کی مدد شامل حال ہوگی اور اُس صورت میں فتح وکامرانی یقینی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جب خالق کائنات کی طرف خانہ کعبہ کی تعمیر نو کا حکم ہوا تو اُنہوں نے اللہ پاک سے عرض کی کہ اس لق ودق صحرا میں عبادت کے لیے کون آئے گا؟ تو غیب سے آواز آئی کہ تمہارا کام صدا لگانا ہے، بندے بھیجنا ہمارا کام ہے۔ آج حرمین شریفین میں حج اور عمرہ کے موقعوں پر تلِ دھرنے کی جگہ نہیں ملتی! خوشحالی اللہ کی حدود کو توڑ کر نہیں، بلکہ حدود اللہ کے نفاذ میں ہے، جیسا کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’اللہ کی حدود میں سے ایک حد کو قائم کرنا اللہ کے ملکوں میں چالیس راتوں کی بارش سے زیادہ فائدہ مند ہے‘‘۔ (سنن ابن ماجہ)

ہماری غربت وافلاس کی وجہ اللہ کی شریعت سے مُنہ موڑنا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ’’جو قوم اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ شریعت کے مطابق فیصلے نہ کرے، اللہ تعالیٰ اُن کے درمیان غربت وافلاس عام کر دیتا ہے‘‘۔(المعجم الکبیر) اور فرمایا: ’’جب کسی قوم کے حکمران اللہ کی کتاب اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کو معطل کر دیتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان خانہ جنگی برپا کر دیتا ہے‘‘۔(شعب الایمان) آج کل ہم اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں۔ سُود کے فوری خاتمے سے ایک دفعہ ہماری معیشت کو دھچکا تو ضرور لگے گا مگر بقول شاعرِ مشرق، علامہ اقبالؒ:

تُندیِ بادِ مخالف سے نہ گھبرا اے عقاب! یہ تو چلتی ہے تجھے اُونچا اُڑانے کے لیے

سُود کی لالی پاپ

سُود کی رسیلی مگر زہریلی میٹھی گولی کا ترک کرنا ہمارے نفس پر بھاری تو ضرور ہوگا، کیونکہ حکومتی سطح پر ہر دور میں سُودی قوانین کو تحفظ فراہم کرنے اور سُودی نظام کا تسلسل جاری رکھنے کے لیے منافقانہ طرزِ عمل اختیار کیا گیا ہے اور اس بے بنیاد پروپیگنڈے کو تقویت دی گئی ہے کہ سُود کے بغیر معاشی نظام نہیں چل سکتا، حالانکہ خود مغربی ممالک سُودی نظام کی تباہ کاریوں سے تنگ آکر اسلامی معیشت کی طرف آنے کے راستے تلاش کر رہے ہیں، مگر ہمارے نام نہاد ماہرین معاشیات غیرسُودی معیشت کے ناقابل عمل ہونے کا ڈھنڈورا پیٹ رہے ہیں۔

چوں کفر از کعبہ برخیزد کُجا ماند مسلمانی!

اگر ہم سابقہ لغزشوں کی معافی اور کفارہ کے طور پر سُود کو زہر قاتل سمجھ کر اس کے خاتمے کے لیے کمربستہ ہوگئے تو نہ صرف ہم غیرملکی شکنجوں سے نجات حاصل کرسکیں گے، بلکہ خوشحالی اور اقوام عالم میں عزت وآبرو اور قدر ومنزلت ہمارا مقدر ہوگا۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

’’وَ لَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَیْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوْعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْاَمْوَالِ وَالْاَنْفُسِ وَ الثَّمَرٰتِ وَبَشِّرِالصّٰبِرِیْنَ‘‘۔ (البقرۃ:۱۵۵)

ترجمہ’’ہم کسی قدر خوف، بھوک اور مال اور جانوں اور میووں کے نقصان سے تمہاری آزمائش کریں گے تو صبر کرنے والوں کو (اللہ کی خوشنودی کی) بشارت سُنا دو‘‘۔

قرآن مجید نے نہ صرف سُود کو حرام قرار دیا ہے، بلکہ اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے سُودی لین دین کرنے والوں کے خلاف جنگ کا اعلان بھی کیا ہے۔ اسی طرح حدیث شریف میں اللہ تعالیٰ نے اپنے ولی (یعنی احیائے اسلام کے سلسلہ میں جدوجہد کرنے والا بندہ) کو اذیت (ذہنی یا جسمانی) پہنچانے والوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کیا ہے۔ اگر حکومتِ وقت سُود کے بارے میں اپنی موجودہ روش پر قائم رہی تو اسے پھر اپنے انجام کی فکر کرنی چاہیے۔ اللہ کے لیے کیا دیر ہے کہ زمین کو ہلکی سی جنبش دے اور

ہولناک زلزلے برپا ہوجائیں یا دریاؤں اور سمندر سے پانی اُچھل کر طغیانیاں تباہی مچادیں!

عائلی قوانین کی غیر شرعی دفعات کا خاتمہ

علمائے حق کی رائے میں مروجہ نکاح فارم میں قرآن وسنت کے مطابق تصحیح، ترمیم اور اصلاح کے لیے مندرجہ ذیل اُمور کی طرف حکام کی فوری توجہ درکار ہے:

ا:......شادی کی عمر کا تعین

اخباری اطلاعات کے مطابق حکومتِ پاکستان، اسلامی نظریاتی کونسل کی تجویز کی روشنی میں لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے شادی کی کم از کم عمر بالترتیب ۱۸ اور ۱۶ سال مقرر کرنے پر غور کررہی ہے۔ شادی کی عمر کا مجوزہ تعین شرعی لحاظ سے بلوغت کی عمر سے زائد ہے۔ قانونِ فطرت اور جدید طبی تحقیق کے مطابق ۱۴/۱۵ سال کی عمر میں بلوغت (Puberty) کا آغاز ہوجاتا ہے، یعنی عورتوں میں ایامِ حیض کے شروع ہونے سے اور مردوں میں داڑھی مونچھ اُگ آنے اور مادہ تولید کے پیدا ہونے سے۔ بلوغت کی اس فطری ترتیب کے باوجود ملک میں کمسنی کی شادی کے واقعات رونما ہورہے ہیں۔ اربابِ اقتدار کو چاہیے کہ معاشرے میں شادی بیاہ اور جہیز کے معاملات میں خلافِ شرع رسم ورواج کی روک تھام کے لیے شریعت کے مطابق قانون سازی کریں۔

قرآن مجید کے مطابق شادی (یعنی نکاح ورُخصتی) صرف نساء (یعنی بالغ عورتوں) سے ہی جائز ہے۔ دینِ فطرت میں نکاح (شادی) کا بنیادی مقصد جائز (شرعی) طریقے سے جنسی تسکین اور افزائشِ نسل ہے۔ ظاہر ہے کہ ایک نابالغہ لڑکی قانونِ فطرت کی وجہ سے ازدواجی زندگی کے جملہ تقاضے (مباشرت یعنی وظیفۂ زوجیت ادا کرنے کی صلاحیت وشعور، اُمورِ خانہ داری یعنی کھانے پکانے کا طریقہ و تجربہ اور گھر کی نگہداشت وغیرہ) پُورے کرنے کی اہل اور متحمل ہی نہیں ہوسکتی۔ مزید برآں وہ عدم بلوغت کی وجہ سے بچے بھی پیدا نہیں کرسکتی، لہٰذا نابالغہ لڑکی کو بیاہ کر لانے سے شادی کا سارا مقصد ہی سِرے سے فوت ہوجاتا ہے، لہٰذا حکومت کم سنی کی شادی کی حوصلہ شکنی کے لیے مؤثر اقدامات کرے۔

پاکستان ایک اسلامی ملک ہے جہاں قرآن وسُنت سے متصادم قانون سازی نہیں ہوسکتی، جب کہ سندھ اسمبلی میں ۱۸ سال سے کم عمر لڑکیوں کی شادی پر پابندی کا بل اتفاقِ رائے سے منظور کرلیا گیا ہے، حالانکہ شریعت میں نکاح کے لیے کوئی عمر متعین نہیں، بلکہ بلوغت شرط ہے جو کہ گرم اور سرد ممالک میں مختلف ہوسکتی ہے۔ مادر پدر آزاد مغربی تہذیب کی نقالی اور ترویج میں صوبائی اسمبلی نے جو سبقت دکھائی ہے، وہ نہ صرف افسوسناک ہے بلکہ باعث تشویش بھی ہے۔

۲:......طلاق کا حق

شریعتِ اسلامیہ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مرد کو افضل بنایا ہے، یعنی اس کا

حق عورت سے زائد ہے۔ ملاحظہ ہو:

’’اَلرِّجَالُ قَوَّامُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰہُ بَعْضَھُمْ عَلٰی بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِھِمْ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ حٰفِظٰتٌ لِّلْغَیْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰہُ‘‘۔ (النساء:۳۴)

یعنی: ’’مردوں کو عورتوں پر قوام (نگہبان) بنایا گیا ہے، کیونکہ وہ عورتوں سے زیادہ طاقت اور قوت والے ہیں اور اُن کی کفالت کے بھی ذمہ دار ہیں تو جو نیک صالح بیویاں ہیں وہ مردوں کے حکم پر چلتی ہیں اور ان کے پیٹھ پیچھے اللہ کی حفاظت میں (مال وآبرو کی) خبرداری کرتی ہیں۔‘‘

قرآن کی رُو سے عورت کو طلاق دینے کا حق صرف مرد کا ہے۔ عورت کو خاوند سے ناچاقی اور بدسلوکی کی صورت میں خلع لینے کا اختیار ہے۔ اُس صورت میں وہ حق مہر (اگر ادا نہ ہوا ہو) کا مطالبہ نہیں کرسکتی، مگر جب مرد طلاق دے تو بقیہ حق مہر کا وہ مطالبہ کر کے وصول کرسکتی ہے۔ اس ضمن میں مروجہ نکاح نامہ کی شق نمبر ۱۸-۱۹ کے تحت شوہر کا بیوی کو حقِ طلاق تفویض کرنا ایک غیر فطری عمل ہے اور شوہر کے جائز حق پر قدغن ہے، جس کا کوئی شرعی جواز نہیں۔ لہٰذا ان دوشقوں کو نکاح نامہ سے حذف کردینا چاہیے۔ البتہ اگر مرد نان ونفقہ اور دیگر شرعی عائد کردہ ازدواجی ذمہ داریاں پورا نہ کرنے کی صورت میں عورت کے مطالبہ پر خلع سے انکار کرے تو اس صورت میں عورت کا عدالت سے رجوع کر کے فسخ نکاح کا دعویٰ دائر کرنا حق بجانب ہوگا، مگر مروجہ عائلی قوانین میں حالیہ ترمیم کے بعد عورت کا عدالت میں صرف یہ کہہ دینا کہ وہ اپنے شوہر کے ساتھ نہیں رہنا چاہتی، طلاق کی ڈگری کے حصول کے لیے کافی ہے، حالانکہ شریعت میں اس کے لیے معقول عذر کا ہونا ضروری ہے۔ سابقہ حکومت کی اس غیر شرعی چھوٹ دینے کی وجہ سے طلاق کی شرح میں غیر معمولی اضافہ ہورہا ہے۔ لہٰذا سرکاری اور نجی شعبہ میں ایسے Comfort Centres (فلاحی وسماجی مراکز) کھولنے کی ضرورت ہے جہاں روٹھے میاں بیوی کے اختلافات ختم کرنے کے لیے مخلص معاونین کی خدمات مل سکیں، تاکہ خاندانی نظام کو تباہ وبرباد ہونے سے بچایا جاسکے۔

۳:......طلاق کا مسئلہ

اہل سُنت (احناف) کے نزدیک مرد اگر ایک ہی نشست میں تین بار طلاق دے تو وہ طلاق مغلظ یعنی مکمل ہوجاتی ہے اور بیوی شرعی لحاظ سے اُس سے جُدا ہوجاتی ہے اور اُسی تاریخ سے اس کی عدت کا شمار شروع ہوجاتا ہے، مگر عائلی قوانین کے آرڈی نینس مجریہ ۱۹۶۱ء کے تحت ایسا نہیں ہے، بلکہ اس کے تحت فریقین کا معاملہ عدالت (فیملی کورٹ) میں پیش ہوتا ہے، جہاں بحث ومباحثہ شروع ہوتا ہے اور عرصہ دراز تک تاریخیں پڑتی رہتی ہیں، جوکہ شریعت کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ بیک وقت تین طلاق کے بعد سابقہ میاں بیوی ایک دوسرے کے لیے نامحرم ہوجاتے ہیں اور ان کو ایک ساتھ رہنے کا کوئی جواز نہیں اور نہ ہی اس مسئلہ میں چیئرمین ثالثی کونسل کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہے، کیونکہ

جب میاں بیوی کا رشتہ ہی ختم ہوگیا تو پھر ثالثی یا صلح وصفائی کس بات کی؟

۴: ...... دوسری شادی کے لیے اجازت نامہ کا حصول

عائلی قوانین مجریہ ۱۹۶۱ء کے تحت مرتب کردہ مروجہ نکاح فارم کی شق نمبر: ۲۱ بھی شریعت سے متصادم ہے۔ مرد کو جائز ضرورت کے تحت دوسری شادی کی اجازت ہے۔ شریعت نے اس پر کوئی بندش نہیں لگائی۔ البتہ اس ضمن میں قرآن مجید کا بیویوں کے درمیان عدل وانصاف کرنے کا قانون واضح ہے، ملاحظہ ہو:

’’وَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تُقْسِطُوْا فِي الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَثُلٰثَ وَرُبٰعَ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً أَوْ مَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ ذٰلِكَ أَدْنٰى أَلَّا تَعُوْلُوْا‘‘۔ (سورۃ النساء:۳)

’’اور اگر تم کو اس بات کا خوف ہو کہ یتیم لڑکیوں کے بارے میں ان سے انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تم کو پسند ہوں دو دو یا تین تین یا چار چار ان سے نکاح کرلو۔ اور اگر اس بات کا اندیشہ ہو کہ (سب عورتوں سے) یکساں سلوک نہ کرسکو گے تو ایک عورت کافی ہے یا لونڈی جس کے تم مالک ہو۔ اس طرح سے تم بے انصافی سے بچ جاؤ گے‘‘۔

لہٰذا چیئرمین ثالثی کونسل سے مرد کو دوسری شادی کرنے کی اجازت لینا یا اس کے لیے کوئی پیچیدہ طریقہ کار کو وضع کرنا مداخلت فی الدین ہے۔ کیونکہ عائلی قوانین میں مروجہ نکاح فارم کی شق نمبر: ۲۳ کے تحت دوسری شادی کے لیے اجازت نامہ کا حصول ضروری ہے، جبکہ شریعت اسلامیہ میں یہ ضروری نہیں اور غیر ضروری کو ضروری قرار دینا ہی مداخلت فی الدین ہے اور اس لیے اس شق کو بھی کالعدم کرنے کی فوری ضرورت ہے، کیونکہ جب تک نکاح یا خلع کے غیر شرعی عائلی قانونی تقاضے سرکاری نکاح فارم کے مطابق پورے نہیں ہوتے، مرد یا عورت دوسری شادی نہیں کر سکتے۔ مروجہ قانونی چارہ جوئی کی وجہ سے فریقین (یعنی سابقہ میاں، بیوی) عرصہ دراز تک عدالتی پیشیوں کے چکروں میں پھنسے رہتے ہیں جو اُن کی بعد از خلع یا طلاق نئی ازدواجی زندگی کی راہ میں نہ صرف بیجا رکاوٹ اور اذیت کا باعث ہے، بلکہ حد درجہ عدالتی تاخیر کی وجہ سے جنسی بے راہ روی کی راہیں ہموار کر رہی ہے۔

۵: ......شادی کا نصب العین

اسلام میں شادی یا نکاح ایک فریضہ اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جب اولاد سن بلوغ کو پہنچ جائے تو اُن کے نکاح کر دیئے جائیں۔ اسلام دین فطرت ہے، اس نے ہر خرابی کو جڑ سے کاٹنے کے لیے بہترین راستے اور طریقے بتا دیئے۔ نکاح کو ہمارے دین نے جتنا سہل اور آسان بنایا، بدقسمتی سے مسلمانوں نے اسے اتنا ہی مشکل اور محال بنا دیا جس کی وجہ سے شادی بیاہ کے معاملات میں غیر ضروری تاخیر ہونے سے نوجوانوں کی عمریں ڈھل رہی ہیں۔ ہمارے معاشرے کی خرابی کی اصل جڑ ریاکاری اور نمائش ہے۔ شادیوں میں زیادہ سے زیادہ خرچ کر کے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ لوگوں میں

ہماری عزت اور بڑا نام ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی دولت کو نمود ونمائش میں خرچ کرنا اور اس کو اچھا جاننا شیطانی کام ہے اور اسراف کرنے والے شیطان کے بھائی ہیں۔ (القرآن، سورۂ بنی اسرائیل: ۲۷)

شریعتِ اسلامیہ میں شادی کا نصب العین Good Will (خوش اسلوبی) ہے، جو تب بھی ممکن ہے کہ جب میاں بیوی میں مہر ومحبت ہو اور یہ اسلامی طرز زندگی ہی بسر کرنے سے ممکن ہے۔ اس کے لیے حکومت کو مغربی تہذیب کے Flood Gates of Sex (جنسی آوارگی وعیاشی کے طوفانی دروازے) بند کرنے ہوں گے، یعنی مرد وزن کی مخلوط محفلیں، ریڈیو اور ٹی وی پر نشر فحش ڈرامے اور پروگرام، بے پردگی، بے حیائی اور فیملی پلاننگ کے تحت Condom اور مانع حمل انجکشن وادویات کا بے دریغ اور خلافِ شرع استعمال وغیرہ۔ علاوہ ازیں ان ادویات کی غیر شادی شدہ افراد کے لیے استعمال کی قانونی ممانعت کی جائے جو ملک میں بدکاری کے فروغ کا موجب بن رہا ہے، جس کا تدارک کرنا بھی اشد ضروری ہے۔ بنا بریں ملکی سطح پر فیملی پلاننگ پروگرام کے غلط اطلاق کو بھی فوری روکا جائے، تاکہ منکرات کا خاتمہ ہو۔

بے حیائی شیطان کا ہتھیار رہے۔ شیطان بڑے عیارانہ انداز سے الیکٹرانک میڈیا کے ذریعہ فحاشی کو فروغ دیتا ہے اور اس کے حیلے بہانے تراشتا ہے۔ زنا بالرضا کے لیے فیملی پلاننگ پروگرام اس کا دلفریب جھانسہ ہے جو اس گناہِ کبیرہ کو نہ صرف تحفظ فراہم کرتا ہے، بلکہ اس کی حوصلہ افزائی بھی کرتا ہے جس کی وجہ سے نوجوان لڑکوں اور لڑکیوں کا ایک بڑا حلقہ بے حیائی اور بے غیرتی کے عمیق غار میں گرتا جارہا ہے۔ اس لیے غیرملکی امداد سے چلنے والے ایسے اخلاق سوز پروگراموں کی کڑی نگرانی کی ضرورت ہے، تاکہ اخلاقی بُرائیوں کا جڑ سے خاتمہ ہو اور ازدواجی زندگیاں خوشگوار گزر سکیں۔

نفاذِ شریعت کے لیے دینی بصیرت سے عاری حکمت عملی کا انسداد

ہمارے معاشرے میں بگاڑ کا بنیادی سبب قول وفعل کا تضاد ہے، جو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا باعث ہے، اس لیے اس سے اجتناب اللہ تعالیٰ کی خوشنودی حاصل کرنے کی اولین شرط ہے۔ اسلام مغرب کے سُودی (سرمایہ دارانہ) نظام، ملحدانہ جمہوریت اور حیا سے عاری دجالی تہذیب کے مقابلے میں ایک اعلیٰ وارفع نظامِ حیات پیش کرتا ہے اور اپنے ماننے والوں اور بالخصوص اربابِ اقتدار کو یہ باور کروانا چاہتا ہے کہ ملک میں موجودہ جاری وساری باطل نظام کے تحت اسلام کا نفاذ ممکن نہیں۔ لہٰذا شریعت اسلامیہ کو بذریعہ نظام خلافت نافذ کریں، کیونکہ نظام خلافت کا قیام ہی ملکی سالمیت کی ضمانت دے سکتا ہے، مگر غیروں سے گلہ ہی کیا، خود اپنوں نے اس دیرینہ ملی مطالبہ کو التوا میں ڈالنے کے لیے دینی بصیرت سے عاری ایسی حکمت عملی وضع کی ہے جس کے تحت ایک جانب ریڈیو، ٹی وی اور میڈیا پر مغرب میں یہود ونصاریٰ کے ہاں سے اسلامی علوم میں P.H.D (پی ایچ ڈی) کی ڈگریاں حاصل کرنے والے نام نہاد اسلامی اسکالر دینی احکامات وتعلیمات کا حلیہ بگاڑ کر اپنے ناظرین کے سامنے پیش کرتے ہیں

اور اِس طرح ملک میں انتشار پھیلا رہے ہیں اور دوسری طرف خود حکومت ورلڈ بینک، IMF اور دیگر غیر ملکی کمپنیوں اور ملکی بینکوں سے سُودی قرضے لے کر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف جنگ کو طول دے رہی ہے۔ اس لحاظ سے ذلت ورُسوائی دین سے رُوگردانی کرنے والے حکمرانوں کا مقدر بن چکی ہے اور عوام مہنگائی، بدعنوانی، رشوت، قتل و غارت اور ظلم وستم کی چکی میں پس رہے ہیں، جس کا مداوا ضروری ہے، تاکہ یہ ملکِ عزیز مزید ٹوٹ پھوٹ کی نذر نہ ہو جائے۔ ہمیں یہ نہ بھولنا چاہیے کہ شرعی احکامات کے خلاف یہ بغاوت اللہ تعالیٰ کے غیظ وغضب کو دعوت دے رہی ہے اور کوئی بعید نہیں کہ اس مسلسل ضد اور ہٹ دھرمی کی وجہ سے ہم مزید آسمانی آفات بالخصوص سیلابوں اور زلزلوں کا شکار نہ ہو جائیں۔

اسلامی نظریاتی کونسل کا دائرۂ عمل واختیارات

اسلامی نظریاتی کونسل ایک آئینی ادارہ ہے جس کا کام آئین کی دفعہ: ۲۳۰ کے تحت دینی معاملات میں حکومت کی راہنمائی کرنا ہے اور اِسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کی ادائیگی کی طرف متوجہ کرنا اور اسلامی احکام کو نافذ کرنے کے لیے موزوں شکل میں مدون کرنا ہے۔

سابق صدر ضیاء الحق دین کے داعی تھے اور ملک میں نفاذِ اسلام چاہتے تھے، انہوں نے سرکاری دفاتر میں نماز باجماعت کا اہتمام کروایا، نظام زکوٰۃ کا حکومتی سطح پر احیا کیا، شرعی حدود کا نفاذ کیا، علما کا وقار بلند کر کے معاشرے میں ان کو جائز مقام ومرتبہ دینے کی کوشش کی۔ وہ اکثر فرمایا کرتے تھے کہ علما میری Constituency ہیں، یعنی وہ میرے حلقہ کے ووٹر ہیں۔ اس مقصد کے لیے عموماً وہ ہر سال علماء ومشائخ کی کانفرنس بلا کر اُن کا اکرام کرتے تھے۔ ۱۹۸۵ء کے آخر میں نفاذِ اسلام کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے اُنہوں نے ایسی ہی ایک علماء ومشائخ کی کانفرنس بلائی جس میں شرکا نے اپنا اپنا نقطۂ نظر پیش کیا۔ آخر میں جسٹس ڈاکٹر تنزیل الرحمٰن صاحب جو اُس وقت اسلامی نظریاتی کونسل کے چیئر مین تھے (اور یہ گنہگار اُن کا نائب یعنی اسلامی نظریاتی کونسل کا سیکرٹری تھا) کو اپنے خیال کے اظہار کا موقع دیا گیا۔ اُنہوں نے بڑی جُرأت ایمانی سے کام لے کر صدر صاحب پر واضح کیا کہ اسلامی نظریاتی کونسل آپ کو اسلامی نظام کے رائج کرنے کے لیے سفارشات پیش کرتی ہے، مگر وہ کسی نہ کسی حیلے و بہانے سے سرد خانے میں ڈال دی جاتی ہیں، جس سے نفاذ اسلام کا کام بُری طرح سے متاثر ہو رہا ہے، لہٰذا بغیر عمل کے ایسی کانفرنسیں بلانے کا کوئی فائدہ نہیں۔ اس پر صدر ضیاء الحق صاحب جلال میں آ گئے اور مائیک پر آ کر چیئر مین اسلامی نظریاتی کونسل کو مخاطب کر کے کہا کہ میں آپ کو تین دن کے لیے بچہ سقہ کی حکومت دیتا ہوں، آپ اسلام نافذ کر کے دکھائیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی اس غیر شعوری جسارت کو معاف فرمائیں، کیونکہ اُن کی اسلام سے وابستگی اور دینی خدمات مسلمہ ہیں۔

اسلام دینِ فطرت ہونے کے ناطے سے ابدی ہے اور دورِ حاضر میں بھی ناقابل عمل نہیں اور نہ ہی اس کے نفاذ کے لیے تین دن کی مہلت درکار ہے۔ اہل اسلام نے تقریباً تیرہ سو سال تک قرآن مجید کو

دستور بنا کر دنیا میں حکمرانی کی اور اس طرح دینِ حق نے ایک بہترین معاشی نظام بھی دیا۔ واضح رہے کہ دو سو سال قبل عالمِ اسلام کی جملہ معیشت سُود سے پاک تھی اور اُس وقت کا معاشرہ آج سے کہیں زیادہ خوشحال اور پُرامن تھا۔ آج بھی خلافتِ راشدہ کا وہ پُرشکوہ اور مثالی دور واپس آ سکتا ہے۔ صرف ضبطِ نفس، انتھک محنت اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ سے کر کے صدقِ دل سے کام کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ راہ کٹھن ضرور ہے، مشکلات اور آزمائشیں آئیں گی، مگر جو ثابت قدم رہے وہ کامیاب ہوں گے کہ اللہ کا وعدہ سچا ہے:

''وَمَنْ يَّتَّقِ اللّٰهَ يَجْعَلْ لَّهُ مَخْرَجًا وَّيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَّتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهُ''۔ (الطلاق:۲،۳)

''اور جو اللہ سے ڈرے گا، وہ اس کے لیے (رنج ومحن سے) مخلصی/ خلاصی کی صورت پیدا کر دے گا اور اس کو ایسی جگہ سے رزق دے گا جہاں سے وہم و گمان بھی نہ ہو اور جو اللہ پر بھروسہ رکھے گا تو وہ اس کی کفایت کرے گا۔''

اسی طرح انگریزی زبان کا یہ مقولہ Where there is a will there is a way سو فیصد درست ہے، یعنی اگر کوئی کام کرنے کا مصمم ارادہ کر لے تو اُس کے لیے راہیں نکل آتی ہیں۔

ایک گمراہ کُن غلط فہمی کا ازالہ

ناقدین کا یہ عذر بے معنی ہے کہ پاکستان میں کون سا اسلام رائج کیا جائے کہ یہاں تو کئی فرقے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا قرآن مجید میں حتمی ارشاد ہے:

''اَلْيَوْمَ اَكْمَلْتُ لَكُمْ دِيْنَكُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِيْ وَرَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا''۔(المائدۃ:۳)

''اور آج ہم نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔''

اور حجۃ الوداع کے موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں پر واضح کر دیا کہ:

''ترکت فیکم أمرین لن تضلوا ما تمسکتم بھما کتاب اللّٰہ و سنۃ رسولہ''۔(موطا امام مالک)

''میں تمہارے پاس دو چیزیں چھوڑ کر جا رہا ہوں۔ اور اگر تم نے اُن کو مضبوطی سے پکڑ لیا تو کبھی گمراہ نہیں ہو گے: ایک اللہ کا کلام یعنی قرآن مجید اور دوسرا میری سُنت''۔

ایک اور موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

''ستفترق أمتی علی ثلثۃ وسبعین فرقۃ، واحدۃ منھا ناجیۃ و البواقی ھالکۃ أو کلھم فی النار إلا واحدۃ، فسئلوہ أی فرقۃ ناجیۃ؟ یار رسول اللّٰہ! قال: ما أنا علیہ و أصحابی''۔ (نسائی)

ترجمہ: ''یہود (بنی اسرائیل) ۷۲ فرقوں میں بٹ گئے اور میری اُمت ۷۳ فرقوں میں بٹ جائے گی، وہ سب ناری (یعنی جہنمی ہوں گے) سوائے ایک کے۔ عرض کیا گیا: وہ

خوش نصیب لوگ کون ہوں گے۔ آپ ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ: وہ لوگ یا گروہ جو میرے اور صحابہؓ کے راستے پر چلنے والا ہو‘‘۔

اس سے روزِ روشن کی طرح عیاں ہوتا ہے کہ اسلام نام ہے طریقۂ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کا، لہٰذا رسول اللہ ﷺ اور صحابہ رضی اللہ عنہم کی اتباع ہم پر لازم ہے۔ حالات کا تقاضا ہے کہ ہم پہلے توبہ تائب ہو کر اپنے سابقہ گناہوں کا کفارہ ادا کریں، تب ہی بفضلہٖ تعالیٰ ہم اسلام کا نفاذ کرنے کے اہل ہو سکیں گے۔

لمحہ فکریہ: اس وقت صورتحال یہ ہے کہ ہم سودی معیشت کو جاری رکھ کر اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کے ساتھ حالت جنگ میں ہیں۔ ہم نے معاذ اللہ بغاوت کر رکھی ہے۔ سماجی و معاشرتی اعتبار سے دیکھیں تو ملک میں فحاشی اور عریانی کا سیلاب آیا ہوا ہے۔ یہ شیطنت بھی اللہ اور اُس کے رسول ﷺ سے کھلی بغاوت ہے۔ سیاسی پہلو سے دیکھا جائے تو ہماری پارلیمنٹ تحفظ نسواں بل جیسے غیر اسلامی قوانین بناتی ہے۔ ہماری عدالتیں قرآن وسنت کی بالادستی کی شق کو آئین کی دوسری شقوں کے مساوی قرار دے کر غیر اسلامی شق کے مطابق فیصلے کرتی ہیں۔ گویا سیاسی اعتبار سے بھی اسلام نہیں ہے، پس جب ملک میں اسلام نہ سیاسی اعتبار سے ہے اور نہ معاشی و معاشرتی اعتبار سے تو پھر ’’اسلامی جمہوریہ پاکستان‘‘ نام میں کیا معنویت رہ جاتی ہے؟! ستم بالائے ستم یہ ہے کہ ہمارے عائلی قوانین تک غیر اسلامی ہیں، جو ایوب خان نے ایک منکر حدیث کے کہنے پر نافذ کیے تھے، حالانکہ مسلمانوں کے عائلی قوانین تو انڈیا جیسے ہندو اکثریت کے ملک میں بھی محفوظ ہیں۔ یہاں تو ۹۵ فیصد مسلمان آباد ہیں اور پھر بھی ہم غیر اسلامی نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ آخر کیوں؟ اللہ تعالیٰ ہمیں اور ہمارے حکمرانوں کو صحیح سمجھ بوجھ اور اخلاص کی دولت عطا فرمائے۔ آمین

نفاذِ شریعت کے لیے پختہ عزم اور نیک نیتی کی ضرورت

وقت آ گیا ہے 67 سال سے اسلام اور نفاذ اسلام کے معاملے میں جو دورنگی اور نیم دِلی چلی آتی ہے، اسے ترک کر کے یک رنگی اختیار کی جائے اور سنجیدگی اور پورے عزم کے ساتھ اسلامی نظریہ اور نظام زندگی کو بفضلہٖ تعالیٰ بالادست اور غالب کیا جائے، جس کے تحفظ کا عہد ہر رکن اسمبلی، وزیر، اسپیکر، ملک کا وزیر اعظم اور صدر کرتا ہے۔ ہمیں یہ یاد رکھنا چاہیے کہ نفاذِ اسلام کا کام اختیاری (Optional) نہیں، یہ ہماری شرعی ذمہ داری ہے، پھر یہ ریاست پاکستان کا مقصد وجود بھی ہے۔ اس کے بغیر ہماری آزادی ادھوری اور ریاست کا نظریاتی جغرافیہ نامکمل، مبہم اور غیر واضح ہے۔ بانی پاکستان نے فرمایا تھا کہ: ’’پاکستان کا مطلب یہ نہیں کہ ہم غیر ملکی حکومت سے آزادی چاہتے ہیں، بلکہ اس کا مطلب مسلم نظریہ ہے، ہمیں صرف اپنی آزادی حاصل نہیں کرنی، بلکہ اس قابل بھی بننا ہے کہ ہم اس کی حفاظت کر سکیں اور اسلامی تصورات اور اصولوں کے مطابق زندگی بسر کر سکیں۔‘‘ (۲۴ نومبر، ۱۹۴۵ء، پشاور میں مسلم طلبا سے خطاب)

اسلامی نظریے کی بالادستی ہی اس ملک کی بقاء واستحکام کی بنیاد ہے اور جس قدر ہم اس نظریے سے

انحراف کریں گے، ریاست کی بنیاد کمزور ہوتی جائے گی اور اس وحدت اور بقا کو لاحق خطرات اور علیحدگی پسندی کے جذبات میں اضافہ ہوتا جائے گا۔ پاکستان کے مشرقی بازو کی علیحدگی اس کی واضح مثال ہے، اس لیے فوری طور پر غیر اسلامی قوانین کا خاتمہ کیا جائے، بلکہ آئین میں موجود چور دروازوں کو بھی بند کیا جائے، جن سے شریعت سے فرار کا راستہ نکلتا ہے۔ اس مقصد کے لیے ضروری ہے کہ دستور میں ترمیم کے ذریعے قرار داد مقاصد (دفعہ: ۲، الف) کو پورے دستور پر حاوی قرار دیا جائے۔ دفعہ: ۲۲۷ (اسلامی احکام) کو دفعہ: ۲، ب کی حیثیت دے کر قرار دادِ مقاصد سے ملحق کر دیا جائے۔ اور وفاقی شرعی عدالت (Federal Shariah Court) کو مستحکم کیا جائے اور اس کے لیے اس کے دائرہ کار پر عائد جملہ تحدیدات ختم کی جائیں جو آئین کی دفعہ (۲۰۳-ج) کے تحت اس پر عائد کی گئی ہیں۔ مزید برآں جید علماء کرام اور مفتیان عظام کو بطور جج وفاقی شرعی عدالت میں تعینات کیا جائے۔ اس وقت صورتحال یہ ہے کہ موجودہ آٹھ جج صاحبان میں سوائے ایک کے کوئی بھی عالم دین نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بلاسُودی معیشت کے طریقہ کار پر نظر ثانی کا ریفرنس پچھلے بارہ سال (یعنی ۶ جون ۲۰۰۲ء) سے وفاقی شرعی عدالت میں جُوں کا توں پڑا ہوا ہے۔ یہ ایک انتہائی اہم معاملے کو سرد خانے میں ڈالنے کی بدترین مثال ہے، لہٰذا پہلے مرحلے میں حکومت نیک نیتی کے اظہار کے طور پر سُود کے حق میں دائر اپنی اپیل سُپریم کورٹ سے واپس لے۔ سچے جذبے کے بغیر نیم دِلانہ اقدامات سے غیر سُودی نظام رائج کرنے کا کام نہ پہلے ہوا ہے اور نہ آئندہ ہو سکے گا!

ہمارے مسائل کا حل صرف اسلام میں ہے

اللہ تعالیٰ کے قوانین (شریعت) کے نفاذ کے بغیر پاکستان میں امن وامان، عدل وانصاف، خوشحالی اور منکرات کا خاتمہ ممکن نہیں، اس حقیقت کا جس قدر جلد ادراک کر لیا جائے اُتنا ہی ہمارے حق میں بہتر ہوگا۔ پہلے ہی ہم ۶۷ سال باطل نظاموں کا طوق پہن کر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو چکے ہیں۔ کاش! کہ ہم جان لیں کہ اللہ کے سوا کوئی ہمارا حامی وناصر نہیں، لیکن اللہ کی مدد حاصل کرنے کی ایک شرط ہے کہ اس کے دامن کو مضبوطی سے تھام لیں اور اس کے ہو کر رہ جائیں۔ اس کی کبریائی کا اعلان کریں اور یہ عہد کریں کہ رب کی دھرتی پر رب کا ہی نظام نافذ کریں گے، إن شاء اللّٰہ۔

یہاں اصل بنیادی مسئلہ آئین (دستور) نہیں، بلکہ اسے نافذ کرنے والے ہیں، کیونکہ اسلامی دستور کی کامیابی سے نفاذ کا انحصار دیگر کئی باتوں کے علاوہ مخلص دینی جذبے سے سرشار دیانت دار قیادت پر ہے، جبکہ دینی ذہن رکھنے والے بیوروکریٹوں کی ایک اچھی خاصی تعداد، نیز معاشرتی ماحول کا اسلامی مزاج میں ڈھلنا بھی بنیادی امر ہے۔ اب غور کیا جائے تو مسلمانوں میں بمشکل دس فیصد لوگ صوم وصلوٰۃ کے پابند ہونے کی وجہ سے دین دار سمجھے جاتے ہیں۔ پھر ان دس فیصد میں بمشکل دو فیصد ہی ایسے ہوں گے جو لین دین، کاروباری معاملات، وراثت کی تقسیم، آمدن اور اخراجات میں شریعت کی مکمل پابندی کرتے ہوں۔

اس سے واضح ہوجاتا ہے کہ نظامِ تعلیم میں نظریاتی سطح پر بنیادی تبدیلیوں کی فوری ضرورت ہے، تاکہ اسلامی معاشرہ کی تشکیل ہوسکے۔ لیکن یہ کتنے دُکھ کی بات ہے کہ اسکولوں میں شلوار قمیض کی بجائے ابتدا ہی سے بچوں کا یونیفارم پینٹ، شرٹ اور ٹائی رکھی گئی ہے اور قرآن کی زبان عربی کی بجائے نہ صرف انگریزی کو شروع سے ہی لازمی مضمون قرار دے دیا گیا ہے، بلکہ اسے ذریعۂ تعلیم بھی بنادیا ہے، جس سے اسلامی تشخص واقدار کا تنزّل و پامالی اور مغربی ثقافت کا فروغ پانا ایک قدرتی امر ہے۔ اگر اربابِ اقتدار نے ہنگامی بنیادوں پر اس طرف توجہ نہ دی تو ہماری آئندہ نسلوں کو تباہی کے دھانے پر پہنچانے میں کوئی چیز مانع نہ ہوگی اور کوئی بعید نہیں کہ پاکستان جیسا اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا ملک اسلامی نظامِ حیات کی ترویج کی بجائے مغربی تہذیب و تمدن کا گہوارہ نہ بن جائے۔ اس لیے حکومتِ وقت کو نصابِ تعلیم اور نظامِ تعلیم کو اسلامی دھارے میں لانے کی فکر کرنی چاہیے جو آئین پاکستان کا تقاضا ہے۔ پاکستان کا آئین حکومت کو پابند کرتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات کو عام کرے، مگر اس کے برعکس ہمارے تعلیمی ادارے یعنی اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں میں قرآن وسنت اور شریعت کی تعلیم نہیں دی جارہی، جو کہ ہماری روحانی اور اخلاقی انحطاط کا موجب ہے اور جس کے ازالہ کی اشد ضرورت ہے، تاکہ ہمارا خالق و مالک راضی ہوجائے۔ اس میں کوئی شک نہیں جو اللہ کا ہوجاتا ہے اللہ اس کے ہوجاتے ہیں اور اس سے زیادہ انسان کی اور کیا خوش نصیبی ہوسکتی ہے؟

دعوتِ فکر وعمل

مقامِ افسوس ہے کہ وزیراعظم میاں محمد نواز شریف صاحب کا دین کی طرف رجحان ہے، مگر اس کے باوجود وہ کسی سیاسی مصلحت کی وجہ سے شریعت نافذ نہیں کررہے۔ اُن کو باری تعالیٰ کا یہ فرمان یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن مجید (سورۃ المائدۃ کی آیت: ۴۴، ۴۵ اور ۴۷) میں اللہ کے احکام کے مطابق حکم نہ صادر کرنے والوں کو کافر، ظالم اور فاسق قرار دیا گیا ہے۔ اور تینوں گروہ جہنم میں جانے والے ہیں۔

جنوب مشرقی ایشیا کے ایک چھوٹے سے مسلمان ملک برونائی کے حاکم' سلطان حسن البلقیہ نے ملک میں اسلامی قوانین کے نفاذ کا اعلان کردیا ہے۔ برونائی اسلام کے نام پر معرض وجود میں نہیں آیا، جبکہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا۔ پاکستان کے حکمران، برونائی کے سلطان ہی سے سبق سیکھ کر ملک میں اسلام نافذ کردیں۔ قیامِ پاکستان سے اب تک نفاذِ شریعت سے فرار ہی اصل خرابیوں کی جڑ ہے اور اسی دوغلی پالیسی نے ملکی سالمیت کے لیے خطرات بڑھادیئے ہیں۔ نفاذ شریعت کے لیے اسلام نے خلافت کا نظام وضع کیا ہے، جس کے احیاء کی اب پھر شدت سے ضرورت ہے، کیونکہ اس کے بغیر اسلام کا کھویا ہوا وقار اور عظمت بحال نہیں ہوسکتی، لہٰذا خلافت کے دوبارہ قیام کے لیے کوشش کرنا فرض ہے اور اس سے غفلت برتنا اللہ کی ناراضگی کو مول لینا ہے۔

قائداعظم نے مرض الوفات میں اپنے ذاتی معالج ڈاکٹر ریاض علی شاہ سے اپنی آخری خواہش کا اظہار ان الفاظ کے ساتھ کیا: ''تم جانتے ہو جب مجھے احساس ہوتا ہے کہ پاکستان بن چکا تو میری روح کو کس

قدر اطمینان ہوتا ہے، یہ مشکل کام تھا اور میں اکیلا کبھی نہیں کرسکتا تھا، میرا ایمان ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا روحانی فیض ہے کہ پاکستان وجود میں آیا، اب پاکستانیوں کا فرض ہے کہ اسے خلافت راشدہ کا نمونہ بنائیں، تاکہ اللہ اپنا وعدہ پورا کرے اور مسلمانوں کو زمین کی بادشاہت دے''۔ (ڈاکٹر ریاض علی شاہ، روزنامہ ''جنگ'' ۱۹۸۸ء)

اس سے معلوم ہوا کہ قائد اعظم ملک میں خلافت راشدہ کا نظام جاری کرنا چاہتے تھے، کیونکہ پاکستان کی نجات صرف نظامِ خلافت کی بحالی میں ہی ہے، جو یہاں شریعت اسلامیہ کے نفاذ کی ضمانت دے سکتا ہے۔ سعودی عرب کے مفتی اعظم شیخ عبدالعزیز نے اپنے خطبۂ حج (۱۴۳۴ھ) میں کہا ہے کہ ''شریعت کو نافذ کرنے سے کامیابی ہمارے قدم چومے گی''۔ یہی اصل کی طرف لوٹنے کا وہ کامیاب نسخہ ہے جس کے بغیر ہم شفایاب نہیں ہوسکتے۔

شریعت اسلامیہ کے نفاذ کے لیے کسی لمبی چوڑی مشق (Exercise) کی ضرورت نہیں۔ مجاز حاکم چاہے وہ خلیفہ وقت ہو یا مملکت کا صدر یا ملک کا وزیر اعظم، صرف پانچ منٹ کے لیے قوم کے سامنے خطاب اور تحریری حکم نامہ سے ملک میں اسلام کا نفاذ کرسکتا ہے، اس طرح کہ وہ سرکاری طور پر اعلان کردے کہ آج مورخہ ۲۷ رمضان المبارک ۱۴۳۵ھ (یا جو بھی تاریخ مناسب سمجھیں) کو ملک میں جو بھی شریعت سے متصادم قوانین رائج ہیں (یعنی سُودی لین دین اور کاروبار، خلاف شرع عائلی قوانین، اخلاقی بندش سے عاری فیملی پلاننگ پروگرام وغیرہ) وہ کالعدم ہیں اور شریعتِ محمدی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کو ملک کا واحد سپریم لاء قرار دینے سے اسلام کا نفاذ ہوگیا۔ باقی جس طرح پانی اپنا راستہ خود بنالیتا ہے، اسی طرح بفضلہٖ تعالیٰ ملک میں اعلان شریعت کے بعد شریعت اپنے نفاذ کے لیے خود راہیں ہموار کرلے گی۔

حرفِ آخر

الغرض پاکستان میں شریعت کو نافذ کرنے کے لیے انتھک محنت و ہمت اور اللہ تعالیٰ پر بھروسہ کرنے کی ضرورت ہے، لہٰذا اہل دین کے لیے احیائے دین اور نفاذ اسلام کی جدوجہد کے بغیر چارۂ کار نہیں، کیونکہ غلبۂ اسلام مقصودِ مومن ہے۔ اس لیے عوام پُر زور مطالبہ کریں اور اسمبلیوں میں منتخب عوامی نمائندے وزیر اعظم، میاں محمد نواز شریف صاحب کی حوصلہ افزائی کریں کہ وہ نفاذ شریعت کے لیے اس جیسی مثالی جُرأت کا مظاہرہ کریں جو انہوں نے یوم تکبیر یعنی مورخہ ۲۸ / اکتوبر ۱۹۹۸ء کو ایٹم بم کا دھما کہ کرنے کے یادگار موقع پر کی تھی۔ اس طرح ان کا نام تاریخ میں سنہری حروف سے لکھا جائے گا اور عوامی نمائندوں کو بھی اس کی ترغیب دلانے کا اجروثواب ملے گا، إن شاء اللّٰہ!

اللہ تعالیٰ اس مرتبہ میاں محمد نواز شریف صاحب کی حکومت کو یہ اہم دینی فریضہ ادا کرنے کی توفیق اور سعادت نصیب کرے۔ آمین

حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینی رحمۃ اللہ علیہ

قاری تنویر احمد شریفی

(یادگارِ اکابر)

۷/شعبان المعظم ۱۴۳۵ھ مطابق ۶/جون ۲۰۱۴ء بروز جمعہ عصر سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے دارالعلوم دیوبند کے قدیم فاضل اور سابق مدرس، جمعیت علمائے ہند کے کارکن، روزنامہ ''الجمعیۃ'' دہلی کے سابق ایڈیٹر، ماہنامہ ''بینات'' کراچی کے ابتدائی دور کے معاون مدیر، ادیب اور کہنہ مشق صحافی، شیخ المشایخ حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینی کا وصال ہوگیا، إنا للّٰہ وإنا إلیہ راجعون۔

عصر سے پہلے مجھے ان کے انتقال کی خبر آگئی تھی۔ عصر کی نماز کے فوراً بعد جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی کا رُخ کیا، بحمد اللہ مغرب سے کچھ دیر پہلے جامعہ پہنچ گیا۔ حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا جسد خاکی جامعہ کے مغربی دروازے سے لایا گیا اور جنازہ گاہ میں رکھ دیا گیا۔ مغرب کی نماز کے بعد حضرت مولانا مفتی عبد الرؤف غزنوی مدظلہم (سابق استاذ دارالعلوم دیوبند، استاذ الحدیث جامعہ بنوری ٹاؤن) نے پانچ منٹ کا خطاب فرمایا، اس کے بعد حضرتؒ کے تلمیذ رشید حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی دامت برکاتہم نے جنازہ پڑھایا۔ جنازے کے بعد حضرتؒ کا آخری دیدار کرایا گیا۔ عشا کے وقت کراچی کے علاقے گلستان جوہر کے قبرستان میں تدفین ہوئی۔ اللہ تعالیٰ خوب خوب اپنی رحمتوں کی ان کی قبر پر بارش فرمائے اور جنت الفردوس عطا فرمائے، آمین!

آخری دیدار کے وقت ذہن کی یادداشت نے ''بیتے ہوئے دن'' سامنے کردیئے۔ راقم الحروف نے بچپن سے جن بزرگوں کو وقتاً فوقتاً دیکھا اور ان کا نام سنا، ان میں سے ایک حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینی قدس اللہ سرہٗ تھے۔ میرے مرشد اول فدائے ملت حضرت مولانا سید اسعد مدنی نور اللہ مرقدہٗ جب کراچی تشریف لاتے تو حضرت مولاناؒ ان کے ساتھ ساتھ رہتے۔ ہمارے مدرسہ تعلیم القرآن شریفیہ جامع مسجد سٹی اسٹیشن اور گھر پر بارہا آپ کی زیارت حضرت فدائے ملت رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ ہوجاتی تھی۔

حضرت فدائے ملتؒ کی حیات میں اور ان کی وفات کے بعد جب بھی میرے مرشد ثانی حضرت مولانا سید ارشد مدنی دامت برکاتہم کراچی تشریف لاتے، اس موقع پر بھی حضرت مولاناؒ ساتھ ساتھ ہوتے۔

۱- ہمارے مدرسہ تعلیم القرآن شریفیہ کے حفاظ کی تنظیم ''تنظیم القراء والحفاظ'' کی ماہانہ نشست میں مرشدی حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم نے خطاب فرمایا تھا، یہ خطاب سٹی اسٹیشن کی مسجد میں ہوا تھا، اس موقع پر میرے جد امجد حضرت مولانا قاری شریف احمد نور اللہ مرقدہٗ نے حضرت مولاناؒ سے درخواست کی تھی کہ حضرت مدظلہم کے بیان سے پہلے تعارفی کلمات جناب ارشاد فرمائیں۔ حضرت مولاناؒ نے یہ ذمے داری بہ خوبی نبھائی۔ اس تعارفی بیان میں آپ نے اپنے استاذ وشیخ، شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہٗ کا واقعہ ارشاد فرمایا تھا کہ غالباً مرادآباد میں ایک جگہ جلسہ تھا، جس میں حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے بیان فرمایا تھا، تعارف کرانے والے نے کچھ اس طرح تعارف کرایا کہ اب میں جس ہستی کو دعوت خطاب دیتا ہوں، یہ وہ ہستی ہیں جنہوں نے اس دنیا میں بڑی مصیبتیں جھیلی ہیں۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کھڑے ہوئے، ارشاد فرمایا کہ انہیں یہ کہنے کا بالکل حق نہیں ہے، اس لیے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جتنی تکالیف برداشت فرمائیں، اتنی تکالیف کسی کو نہیں آئیں۔

۲- استاذ محترم شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں قدس اللہ سرہٗ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا عبدالغنی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے ''مرتبۂ تصوف'' پر ایک کتاب مرتب فرمائی تھی اور اس کا مسودہ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے پاس اس لیے بھیجا تھا کہ آپ اُسے حضرت مولاناؒ کو دکھا کر کچھ لکھوا لیجئے۔ حضرت قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے مجھے حکم دیا کہ حضرت مولاناؒ سے رابطہ کروں اور ملاقات کا وقت طے کروں۔ میں نے حضرت مولاناؒ کو فون کیا تو معلوم ہوا کہ مولانا کبھی اپنی صاحبزادی کے ہاں گلشن اقبال میں ہوتے ہیں اور کسی وقت اپنے مکان واقع جہانگیر روڈ تشریف لے آتے ہیں۔ حضرت مولاناؒ نے مجھے تاریخ اور دن بتادیا کہ اس دن میں فلاں وقت آجا۔ میں حاضر ہوا، حضرت مولاناؒ نے بزرگانہ شفقت فرمائی، میں نے مسودہ پیش کیا تو بہت دیر تک اسے دیکھتے رہے، پھر ارشاد فرمایا کہ میں اسے پڑھ کر مقدمہ لکھوں گا۔ اس سلسلے میں شاید ایک مرتبہ اور حضرت مولاناؒ کی خدمت میں حاضری دی، لیکن بعد میں وہ مقدمہ لکھا گیا یا نہیں؟ اس کا مجھے علم نہیں، یہ کوئی بیس سال پہلے کی بات ہے۔

۳- استاذ محترم ڈاکٹر ابوسلمان صاحب شاہ جہاں پوری مدظلہم (جنرل سیکرٹری مجلس یادگار شیخ الاسلام، پاکستان، کراچی) نے فروری ۲۰۰۹ء میں فرمایا کہ حضرت مولانا سے وقت لے کر ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا دل چاہتا ہے۔ میں نے ۱۰ر فروری کو فون کیا تو آپ نے فرمایا: جب چاہو آجاؤ، لیکن آنے سے ایک گھنٹہ پہلے فون کرلینا، چنانچہ ۱۱ر فروری بدھ کے دن عصر سے پہلے فون کر کے حاضر خدمت ہوئے۔ آپ بہت خوش ہوئے۔ محترم ڈاکٹر صاحب نے کچھ سوالات کیے، حضرت مولاناؒ نے ان کے جوابات ارشاد فرمائے۔ عصر کی اذان ہوئی تو ارشاد فرمایا کہ میں اپنی ضعیفی کی وجہ سے پنج وقتہ نمازوں میں

مسجد نہیں جا سکتا، گھر پر ہی نماز پڑھ لیتا ہوں، کبھی کوئی آجاتا ہے تو گھر میں جماعت نصیب ہو جاتی ہے، آج تم آگئے، تم نماز پڑھاؤ، تاکہ میں جماعت کے ساتھ نماز پڑھ سکوں۔ ضعیفی کی یہ حالت تھی کہ جب ہم مہمان خانے میں بیٹھے تھے اور حضرت مولاناؒ اپنے کمرے سے تشریف لائے تو دونوں ہاتھوں سے دیوار پکڑ کر مہمان خانے میں آئے تھے، لیکن واہ رے قدرت! نماز کھڑے ہو کر پڑھی، یہ ہمارے بزرگوں سے ایک روایت چلی آرہی ہے۔ اولیاء اللہ کے اس قسم کے واقعات کتابوں میں کثرت سے لکھے ہوئے ہیں۔

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ سے اس مجلس میں جو سنا، وہ یہ ہے: جمعیت علمائے اسلام کی تاسیس پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کا خطبۂ صدارت ''عصر جدید'' میں چھپا تھا۔ حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ نے جب اسے پڑھا تو مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیا، میں نے اسے پڑھ کر حقارت سے رکھ دیا اور عرض کیا: عقل سلب ہوگئی، اندھے ہوگئے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کو غصہ آگیا، سفر کی حالت میں تھے، جب دوپہر کو کھانے کا وقت ہوا تو حضرتؒ نے از خود کھانے کا ٹفن اٹھایا اور کھانا کھانا شروع کر دیا، مجھے پوچھا بھی نہیں، اس سے پہلے سفر میں مجھ سے فرماتے تھے کہ کھانے کے لیے ٹفن اٹھاؤ اور دسترخوان بچھاؤ، لیکن اس مرتبہ ایسا نہیں ہوا، میں نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ ٹرین کا سفر تھا، جب شام ہوگئی تو پھر مجھ سے بات فرمائی اور ارشاد فرمایا: مولانا عثمانی جس کام میں لگے ہوئے ہیں وہ پوری دیانت کے ساتھ اسے انجام دے رہے ہیں، جو بات انہوں نے فرمائی اُسے وہ بہتر سمجھتے ہیں، ہمیں ان کی بات میں شرح صدر نہیں، اس لیے ہم ان سے اتفاق نہیں کرتے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ان کی شان میں بے ادبی کی جائے۔ یہ حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہٗ کا ظرف تھا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں اکابر کے درجات بلند فرمائے، آمین! شیخ التفسیر حضرت مولانا احمد علی لاہوری نور اللہ مرقدہٗ نے اپنے متعلق فرمایا کہ میں نے سترہ حج کیے ہیں، ہر حج میں تمام اولیاء اللہ کا اجتماع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سربراہی میں ہوتا ہے، ان اجتماعات میں حضرت مدنی نور اللہ مرقدہٗ سے زیادہ بڑا ولی میں نے کسی کو نہیں پایا۔ حضرت علامہ سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہونے گئے تھے، یہ میرے سامنے کی بات ہے کہ اس موقع پر اس حدیث پر بحث کی جس میں داڑھی ایک مٹھی ہونے کا ذکر ہے۔ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ نے سید صاحبؒ کو فرمایا کہ آپ حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ کے پاس جائیے اور ان سے بیعت کی درخواست کیجئے۔

۴- یکم مارچ ۲۰۰۹ء اتوار کی صبح دس بجے حضرت مولانا مرحوم سے فون پر اجازت لے کر ان کی خدمت میں پھر حاضر ہوئے، حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے حالات قلم بند کرائے۔ آپؒ کے آباء و اجداد مغلوں کے دور حکومت سے اونچے مراتب پر تھے۔ شیر شاہ سوری کے زمانۂ حکومت میں دہلی کے قرب و جوار میں آباد ہوئے، انہیں ایک جاگیر بھی ملی، جو ''گلاوٹھی'' کا علاقہ تھا، یہی حضرت مولانا کا وطن تھا۔ ۲۶ رمحرم الحرام ۱۳۳۲ھ مطابق ۲۰ ردسمبر ۱۹۱۳ء بروز جمعرات، گلاوٹھی ضلع بلند شہر میں پیدا ہوئے۔ ننھیال نے ''محمد اصلح''، اور منجھلے دادا نے ''آل حسن'' نام رکھا۔ قمری تقویم کے لحاظ سے تاریخی نام ''منظر الاعلیٰ''، اور شمسی

تقویم سے ''افضل الفاضلین'' نکلتا ہے۔

آپ کے والد کا نام نامی محمد صالح تھا، آپ کے دادا مولانا سید محمد حسن صاحبؒ حضرت مولانا محمد حسین مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ تھے، جب کہ آپ کے والد امام ربانی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت تھے۔حضرت مولانا مرحوم نے ابتدائی تعلیم سے موقوف علیہ تک ''مدرسہ منبع العلوم'' گلاوٹھی (جو دارالعلوم دیوبند سے تقریباً دوسال پہلے قائم ہوا تھا) میں ۱۹۲۷ء تک تعلیم حاصل کی۔اس کے بعد تین سال مختلف علوم کی تعلیم مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی میں حاصل کی۔اس کے بعد دورۂ حدیث شریف کے لیے دارالعلوم دیوبند تشریف لے گئے اوراپنے وقت کے ''جبال علم'' سے حدیث شریف کی کتابیں پڑھیں۔آپؒ کے اساتذہ میں شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ ، اعزاز العلماء حضرت مولانا محمد اعزاز علی امروہوی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا رسول خان ہزاروی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا میاں سید اصغر حسین محدث دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا محمد ابراہیم بلیاوی رحمۃ اللہ علیہ اورحضرت مولانا مفتی ریاض الدین رحمۃ اللہ علیہم شامل تھے۔

امیر شریعت حضرت مولانا سید منت اللہ رحمانی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا مرغوب الرحمٰن بجنوری رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند) حضرت مولانا حافظ حبیب اللہ لاہوری مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا قاضی زاہد الحسینی رحمۃ اللہ علیہ (مصنف چراغِ محمد) حضرت مولانا قاری عبدالرؤف ترنالوی رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا محمد ایوب جان بنوری رحمۃ اللہ علیہ ، حضرت مولانا عبدالمنان رحمۃ اللہ علیہم آپ کے ہم سبق تھے۔شعبان المعظم ۱۳۵۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۳۲ء میں آپ دارالعلوم دیوبند سے فارغ ہوئے۔

فراغت کے بعد کچھ عرصہ دیوبند اور دہلی میں رہے۔ ۱۹۳۵ء میں مدرسہ عالیہ فتح پوری دہلی سے ''مولوی فاضل'' کیا۔اس کے بعد آپ بھوپال میں ''علما کونسل'' کے رکن بنادیئے گئے۔کچھ عرصہ بھوپال میں قیام کے بعد آپ بہاولپور چلے گئے اور''ادیب فاضل'' کا امتحان پاس کیا۔۱۹۳۷ء میں سحبان الہند حضرت مولانا احمد سعید دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی ترغیب سے دہلی میں قیام کا فیصلہ کیا۔اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلم میں تاثیر رکھی تھی اوراہل علم بھی آپ کی تحریرات کے قدرداں تھے۔آپ کی تحریری خدمات ''مؤتمر المصنفین دہلی''، ''مجلس قاسم العلوم دیوبند''، ''استقلال دیوبند'' (اخبار) ''گل فروش'' (اخبار) ''ماہنامہ قائد مرادآباد'' سے خوب ظاہر ہوئیں۔ان خدمات کی بنا پر مجاہد ملت حضرت مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی رحمۃ اللہ علیہ اورحضرت سحبان الہند رحمۃ اللہ علیہ نے روزنامہ ''الجمعیۃ دہلی'' کا ایڈیٹر آپ کو بنادیا۔ساتھ ہی حضرت سحبان الہند رحمۃ اللہ علیہ کے ادارے ''مؤتمر المصنفین'' اور حضرت مولانا مفتی عتیق الرحمٰن عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے ادارے ''ندوۃ المصنفین'' میں بطور مؤلف اورمترجم خدمات انجام دیتے رہے۔۱۹۳۸ء تک آپ دہلی میں رہے۔۱۹۳۸ء میں ''الجمعیۃ'' کی ضمانت ضبط ہوگئی اوراخبار بند ہوگیا۔

''جداگانہ وفاق'' کے عنوان سے آپ کا اداریہ معرکۃ الآرا تھا۔اس میں آپ نے انگریز کی تقسیم ہند کی صورت میں منافقانہ پالیسیوں اورتقسیم کے بعد ہندوستان کی جو حالت زار (خصوصاً مسلمانوں کی) متوقع تھی، اس کو اپنی سیاسی بصیرت سے واضح فرمایا تھا۔دسمبر ۱۹۳۸ء میں ''الجمعیۃ'' کی ضمانت ضبط

اوراخبار کی بندش کے بعد حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد بہاری رحمۃ اللہ علیہ نے آپ کو ہفت روزہ ''الہلال'' پٹنہ کی ادارت کے لیے منتخب فرمایا۔۱۹۴۰ء تک آپ پٹنہ میں رہے،اس کے بعد آپ لاہور چلے گئے اور''زم زم'' میں کام کیا،اس کے بعد کچھ عرصہ ''مدینہ'' بجنور میں کام کیا۔

اسی زمانے میں آپ کی امام الہند حضرت مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے پہلی مرتبہ ملاقات ہوئی۔ آپ خود ارشاد فرماتے تھے:''مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ نہایت عالی اخلاق کے مالک تھے۔حضرت مولانا ابوالمحاسن محمد سجاد رحمۃ اللہ علیہ نے مولانا آزاد رحمۃ اللہ علیہ سے آپ کی ملاقات کے لیے وقت لیا، جو صبح آٹھ بجے کا تھا اور آپ کو یہ بتلا دیا کہ مولانا آزادؒ وقت کے بہت پابند ہیں، آپ کو بھی پابندی کرنی ہوگی،مولانا آزادؒ نے دس منٹ کا وقت دیا تھا،مگر مولانا ابوالمحاسنؒ نے آپ کو یہ نہیں بتلایا تھا،ان کے گھر کے لان میں کرسیاں بچھی ہوئی تھیں،آپ جا کر وہیں بیٹھ گئے اور مولانا آزادؒ ٹھیک آٹھ بجے تشریف لے آئے،علیک سلیک کے بعد مولانا آزادؒ نے آپ سے ملاقات کا مقصد پوچھا،آپ نے عرض کیا:''صرف زیارت''اس پر مولانا آزادؒ بڑی دیر تک جزاک اللہ کہہ کر شکریہ ادا کرتے رہے۔اس کے بعد مولانا آزادؒ ایک نہایت مشفق استاذ کی طرح آپ کو سیاسیات کا ایک طالب علم سمجھ کر سمجھاتے رہے اور آپ اس وقت تک ان کے پاس بیٹھے رہے جب تک خادم نے اندر سے آواز نہ دے دی کہ جی کھانا حاضر ہے،کیا میں کھانا لگادوں؟ دس منٹ کی ملاقات پانچ گھنٹے پر محیط ہوگئی۔

۱۹۴۲ء سے ۱۹۴۸ء تک آپ دارالعلوم دیوبند میں فارسی کے استاذ رہے۔۱۹۴۸ء میں آپ کو پاکستان آنا پڑا،آپ کی ہمشیرہ بیمار تھیں،ان کی عیادت کے لیے آئے تھے اور پھر یہیں کے ہوکر رہ گئے۔ حضرت مولانا محمد ادریس میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کے''ادارۂ شرقیہ'' میں مدرس رہے۔۱۹۴۹ء میں ریڈیو پاکستان سے منسلک ہوگئے۔۳۲ سال ریڈیو پاکستان میں کام کیا اور اسلامی موضوعات پر لیکچر دیئے۔عربی اور فارسی براڈ کاسٹنگ کے فرائض اس کے علاوہ تھے۔۶۵-۱۹۶۴ء میں ماہنامہ بینات کراچی سے بھی منسلک رہے۔۸۰-۱۹۷۹ء میں تبلیغی کالج (مفتی محمودؒ روڈ) سے منسلک رہے۔

آپ کی مؤلفات اور تراجم میں جو نام معلوم ہوسکے،وہ یہ ہیں:

۱-دارالتصنیف (تبلیغی کالج) کے تحت قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ۔

۲-اسلامی تمدن اور یورپین تہذیب۔ ۳-امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کا علمی سفر۔

۴-تاریخ مذاہب فقہ۔ ۵-اسلامی تصوف۔

۶-خلفائے راشدینؓ۔ ۷-شریعت بل اور لیگ۔

۸-صبح اسلام۔ ۹-المنجد (مترجمین کی کمیٹی میں آپ بھی تھے)۔

آپ کو لکھنے کا کتنا ملکہ حق تعالیٰ شانہ نے عطا فرمایا تھا؟ آپ کی اس تحریر سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے:

''مولانا اختر اسلام صاحب مدیر مجلّہ قائد مراد آباد ایک عرصے سے مضمون کے لیے اصرار کررہے تھے،لیکن زمانے کی ستم ظریفی کہوں یا طبیعت کی پراگندگی کہ دو ڈھائی سال کے مسلسل تقاضوں

www.banuri.edu.pk

کے باوجود آج تک اپنے اس محترم کے ارشاد کی تعمیل نہ کی جاسکی، اور بالآخر انہی تقاضوں نے اُس طرف خفگی اور اس طرف حجاب کی صورت اختیار کر لی۔ اس مرتبہ قسمت نے جمعیت کے اجلاس جون پور پہنچا دیا، حجاب و خفگی کی ملی جلی فضا میں مولانا سے بھی ملاقات ہوگئی اور اسی ملاقات کے نتیجے میں آج کئی دن سے مراد آباد میں نظر بند ہوں۔ اختر صاحب کا فیصلہ ہے کہ جب تک میں ایک عدد مضمون لکھ کر ان کے حوالے نہیں کردوں گا، اس وقت تک مجھے اپنی آزادی کے متعلق اشاداومی نہ ہونا چاہئے۔ تجویز ترمیم کی دسترس سے گزر چکی ہے، خوف ہے کہ کسی مزید ترمیم کا نوٹس لاٹھی چارج کے سامراجی حکم کے لیے وجہ جواز نہ بن جائے، ناچار تعمیل حکم کر رہا ہوں اور اس بے کسی و بے چارگی کے عالم میں کر رہا ہوں کہ تاریخ کی دو ایک کتابوں کے علاوہ مطالعے کے لیے کچھ میسر نہیں ہے''۔ (قائد، جولائی، ۱۹۴۰ء، ص: ۹)

آپ اندازہ کیجئے کہ کس حالت میں مضمون لکھا ہوگا؟ صرف سرسری نہیں، بلکہ میرے پیش نظر اس مضمون کی پہلی قسط پندرہ صفحات اور دوسری قسط سات صفحات پر مشتمل ہے، اللہ جانے کہ کتنی قسط میں یہ مضمون مکمل ہوا ہوگا؟ مضمون کی باقی قسطیں نظر سے اوجھل ہیں۔ مضمون کا عنوان ''کاروانِ اسلام ہندوستان کے غربت کدہ میں'' ہے، جو نہایت اہم ہے۔ اسی رسالے میں حضرت مولاناؒ کے ادبی شہ پارے بھی ہیں ''جنگ کے دو چہرے'' کے عنوان سے اور دوسرا ''امن کے دو چہرے'' کے عنوان سے۔

آپ کے تلامذہ میں حضرت مولانا عبید اللہ انور رحمۃ اللہ علیہ (جانشین حضرت مولانا لاہوری رحمۃ اللہ علیہ) حضرت مولانا نصیر احمد خان رحمۃ اللہ علیہ (سابق صدر مدرس دار العلوم دیوبند) پروفیسر مولانا محمد ولی رازی (صاحب ہادیٔ عالم) کے نام نمایاں ہیں۔

حضرت مولانا مرحوم حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے، آپؒ کی وفات کے بعد آپؒ کے خلیفہ مجاز حضرت مولانا پیر خورشید احمد ہمدانی رحمۃ اللہ علیہ سے بیعت ہوئے اور خلافت سے سرفراز ہوئے۔ اس کے علاوہ اور بہت سے بزرگوں نے آپؒ کو خلافت دی، لیکن یہ درست نہیں کہ آپ حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ ہیں۔ نیز یہ بھی درست نہیں کہ آپ کو شیخ الحدیث حضرت مولانا سید حامد میاں رحمۃ اللہ علیہ سے اجازت حاصل ہے۔

آپ کے خلفا میں نامور ماہر اقبالیات جناب امیر احمد عثمانی، حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہ، حضرت مولانا مفتی ڈاکٹر نظام الدین شامزئیؒ، مولانا ابو عمر محمد حنفی، حضرت مولانا ڈاکٹر محمد عبد الحلیم چشتی مدظلہ، حضرت مولانا مفتی لئیق احمد اسعدی مدظلہ، ڈاکٹر محمد صابر آرائیں، مولانا شبیر احمد مدنی اور دیگر علما شامل ہیں۔

حضرت مولاناؒ کو حضرت شیخ الاسلام رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے خانوادے سے عقیدت و محبت تھی، اسی طرح خانوادۂ مدنی بھی ان کا اکرام کرتا تھا۔ مرشدی حضرت مولانا سید ارشد مدنی مدظلہم (صدر جمعیت علمائے ہند) ایک دفعہ پاکستان تشریف لائے تو مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس سفر میں کراچی صرف تین شخصیتوں کی وجہ سے آیا ہوں: ایک حضرت مولانا سید محمد اصلح الحسینیؒ، دوسرے حضرت مولانا قاری شریف احمد

صاحبؒ اور تیسرے ڈاکٹر ابوسلمان شاہ جہان پوری۔

حضرت مولانا مفتی عبد الرؤف غزنوی مدظلہم حضرت مولاناؒ کے جنازے کے موقع پر بیان فرمارہے تھے کہ میں ابھی حال (مئی ۲۰۱۴ء) میں دیوبند گیا تو سب سے پہلے حضرت مولانا ارشد مدنی صاحب مدظلہم نے حضرت مولاناؒ کی خیریت دریافت فرمائی تھی اور واپسی میں کچھ ہدایا حضرت مولاناؒ کے لیے دیئے تھے، جس میں خصوصی طور سے دیوبند کا عطر بھی تھا، جب وہ حضرت مولاناؒ کو پیش کیا گیا تو حضرتؒ نے بڑے تپاک سے اُسے قبول فرمایا، وہ عطر زندگی میں تو نہیں لگا سکے، اس لیے کہ بیماری کی وجہ سے ہسپتال میں تھے، لیکن انتقال کے بعد وہ عطر آپ کے کفن پر استعمال کیا گیا ہے۔

حضرت مولاناؒ کے نام حضرت شیخ الاسلام نور اللہ مرقدہٗ کا ایک گرامی نامہ درج کررہا ہوں، جو حضرت مولاناؒ نے میری خواہش پر مجھ کو عطا فرمایا تھا، وہ خط یہ ہے:

''عزیزم سلمکم اللہ تعالیٰ.................................السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

مزاج شریف، آپ کے متعدد والا نامہ جات خوش کن اور اندوہ افگن ہر طرح کے آئے۔ میرے عزیز! رنج کرنا نہایت غلطی ہے: مَا أَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَةٍ فِیْ الْأَرْضِ وَلَافِیْ أَنْفُسِکُمْ إِلَّا فِیْ کِتَابٍ مِّنْ قَبْلِ أَنْ نَّبْرَأَهَا إِنَّ ذٰلِکَ عَلٰی اللّٰهِ یَسِیْرٌ لِکَیْلَا تَأْسَوْا عَلٰی مَافَاتَکُمْ وَلَاتَفْرَحُوْا بِمَا آتَاکُمْ۔

تقدیرات الٰہیہ میں چوں و چرا، رنج وغم کرنا نہایت غلطی ہے، ہم کو اسباب میں کوشش کرنی چاہیے، ناکامی ہو تو کبیدہ خاطر نہ ہوجیے، اگر ایک دروازہ بند ہوا ہے دوسرا کھلے گا۔ جس نے پیدا کیا ہے رزق دے گا۔

اپنے افعال واقوال شریعت اور سنت نبویہ (علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ) کے مطابق کیجئے۔ وہیں رہ کر مشاغل علمیہ میں مشغول ہوجایئے۔ حضرت قاضی صاحب کے زیر نظر بہت سے مدارس ہیں، بلا تنخواہ کتابیں پڑھایئے، تا آنکہ لیاقت درست ہوجائے:

صبر کن حافظ بسختیِ روز و شب
عاقبت روزے بیابی کام را

جناب قاضی صاحب زید مجدہم اور مولانا ریاض الدین صاحب کی خدمت میں میرا سلام اور استدعاء دعا عرض کردیجئے۔ دعواتِ صالحہ سے فراموش نہ فرمایئے۔

والسلام

ننگ اسلاف حسین احمد غفرلہ

۱۲ شعبان ۱۳۵۵ھ (۲۷/اکتوبر ۱۹۳۶ء)

غیر مسلموں کے تہوار پر مسلمان کا ہدیہ قبول کرنا!

ادارہ

کیا فرماتے ہیں علمائے کرام اس مسئلہ کے بارے میں کہ:

میں مانچسٹر (برطانیہ) سے تعلق رکھنے والی ایک کمپنی میں کام کرتا ہوں۔ ہماری کمپنی کے ڈائریکٹر صاحب نے کمپنی کے تمام ملازمین کو کرسمس ڈے سے قبل دس اور بیس پاؤنڈ کے ''کرسمس گفٹ واؤچر'' اور ''کرسمس کارڈ'' دیئے ہیں۔ کیا آپ مجھے اسلامی شریعت کی روشنی میں بتا سکتے ہیں کہ ان واؤچرز کو استعمال اور خرچ کرنا جائز ہے؟ اگر نہیں تو ان واؤچرز کا کیا کیا جائے؟ جزاک اللہ۔ مستفتی: محمد فرحان طائی

الجواب حامدًا و مصليًا

واضح رہے کہ اگر کفار کے تہواروں کی تعظیم دل میں نہ ہو تو ایسے مواقع پر ان کی طرف سے گفٹ کی گئی چیزیں لینا اگر چہ جائز ہے، لیکن تشبہ کی بنا پر احتیاط بہتر ہے۔

لہٰذا صورتِ مسئولہ میں اگر سائل نے کرسمس ڈے کے موقع پر کمپنی ڈائریکٹر کی طرف سے گفٹ، کرسمس کارڈ، وغیرہ صرف بطور ہدیہ وگفٹ کے وصول کیے ہیں، تعظیم مقصود نہیں ہے تو ایسی صورت میں اگر چہ اس کا لینا جائز ہے، لیکن تشبہ بالکفار ہونے کی بنا پر احتراز مقصود ہے، نہ لینے میں ہی بہتری ہے۔

فتاویٰ شامی میں ہے:

''ولو أهدى لمسلم ولم يرد تعظيم اليوم بل جرى على عادة الناس لايكفر وينبغي أن يفعله قبله أو بعدهٗ نفيًا للشبهة''۔ (شامی، ج:۶، ص:۷۵۴، ط: سعید)

''آپ کے مسائل اوران کا حل'' میں ہے:

''سوال: کرسمس کے موقع پر ۲۵ دسمبر سے ایک دو دن قبل ہر سال دفتری اوقات میں عیسائی ملازمین کرسمس پارٹی کا بندوبست کرتے ہیں، جس میں ہم مسلمان لوگوں کو بھی

اخلاقاً کھانے، کیک وغیرہ کھانا پڑتے ہیں، کیا مسلمان ملازمین کے لیے کرسمس پارٹی کے یہ کھانے وغیرہ کھانا صحیح ہے؟

جواب: جائز ہے۔(ج:۲،ص:۱۳۱، ط: لدھیانوی)''

فتاویٰ محمودیہ میں ہے:

''سوال: اگر کسی مسلمان کے رشتہ دار ہندو کے گاؤں میں رہتے ہوں اور ہندو کے تہوار ہولی دیوالی وغیرہ پکوان، پوری، کچوری وغیرہ پکاتے ہیں، ان کا کھانا ہم لوگوں کو جائز ہے یا نہیں؟

جواب: جو کھانا کچوری وغیرہ ہندو کسی اپنے ملنے والے مسلمان کو دیں اس کا نہ لینا بہتر ہے، لیکن اگر کسی مصلحت سے لے لیا تو شرعاً اس کھانے کو حرام نہ کہا جائے گا۔(ج:۱۸،ص:۳۴، ط: فاروقیہ)

الجواب صحیح	الجواب صحیح	الجواب صحیح	کتبہ
ابوبکر سعید الرحمٰن	محمد انعام الحق	شعیب عالم	محمد جہاں زیب خان
			تخصص فقہ اسلامی

جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

www.banuri.edu.pk